کٹھ پتلیاں

سلیم الحق حقی

اظہار ازل سے انسان کے بنیادی مسائل میں سے ایک ہے اور ابد تک رہے گا۔ بلاشبہ اظہار کی خواہش بھی انسان کے قوی تر محرکات میں شامل ہے۔ اظہار کی راہ نہ ملے تو وہ کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ وہ منوجہ کام سرانجام کرتا ہے اور زبان خاموشی سے اپنے ہم جنسوں سے کہتا ہے کہ مجھے دیکھو، میں بھی وجود رکھتا ہوں۔ وہ خود کو مضحکہ خیز بناتا ہے، ذلتیں اوڑھ لیتا ہے.... صرف اظہار وجود کی خاطر۔ کبھی وہ بیلاضہ ورت خود کو جرم کے راستوں پر لے جاتا ہے لیکن یہ سب منفی صورتیں ہیں، منفی رویے ہیں۔ خواہش اظہار بے سمت نہ ہو اور انسان تن آسانی کا عادی نہ ہو تو یہ خواہش اس سے بہت بڑے کام سرانجام دلواتی ہے۔ درحقیقت خواہش اظہار ایک ایسا بیج ہے جس سے حسن کا پودا پھوٹتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں، پھلوں سے لدے سایہ دار درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خواہش اظہار منفی ہو تو آزار بھی آزار، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی اور مثبت ہو تو قوت تخلیق ہے۔ ایسے میں انسان اظہار کا سچا ہوتا ہے۔ وہ اپنی خامیوں کے اظہار سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسے لوگ سچے فن کار ہوتے ہیں۔ اظہار کے گونگوں میں یہ مثبت خواہش آنسوؤں کا روپ دھارتی ہے، آنکھوں سے زبان مانگتی ہے اور چہرے کو کتاب بنا دیتی ہے لیکن یہ اظہار انہی لوگوں تک پہنچتا ہے جن کے دلوں کو گداز اور آنکھوں کو باریک بینی کا شرف میسر ہوتا ہے۔

زیر نظر تحریر اس انسان کی کہانی ہے، جس نے آنکھیں کھولتے ہی معصومیت کو غلام اور معصیت کو حکمراں دیکھا، نیکی کو زبوں حالی میں اور بدی کو پھلتے پھولتے دیکھا۔ اس نے اپنی بقا کی خاطر اپنے اندر کی نیکی اور معصومیت سے ناتا توڑ کر معصیت اور بدی سے رابطہ استوار کر لیا۔ معصومیت کسی میں بھی ہو، اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے معصیت کی اتنی بھی معصومیت کو معصیت میں لتھڑا ہوا دیکھ کر وہ معصومیت

کو مغلوب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک کچلا ہوا آدمی تھا لیکن اس کی خواہش اظہار بہت توانا تھی۔ چنانچہ اس نے کٹھ پتلیاں تخلیق کیں۔ وہ اظہار کا سچا تھا۔ اس نے اپنی تخلیق کردہ کٹھ پتلیوں کو اپنے وجود کی تمام سچائیاں، تمام رنگ سونپ دیے لیکن خود اپنے وجود کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔ صرف اس لیے کہ وہ انا پرست بھی تھا۔ یہ اس محروم و محزون لڑکی کا افسانہ ہے، جسے انسانوں کے بجائے کٹھ پتلیوں نے سہارا دیا۔ وہ کنول کے اس پھول کی طرح تھی جو کیچڑ میں رہنے کے باوجود پاکیزہ اور معصوم رہتا ہے۔ یہ کہانی اس آفاقی حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ نیکی اور معصومیت کو کبھی فنا نہیں ہے۔

نیکی اور بدی کی ازلی اور ابدی کشمکش کی کہانی [illegible]

میلی

کی روشنیاں رات کے ساتھ دم توڑ رہی تھیں۔ ہجوم چھٹ چکا تھا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی اور سمندر بُری طرح بپھرا ہوا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی خود کو سمندر کے سپرد کرنے کی نیت سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دُبلی پتلی اور عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے جسم پر گوشت بالکل نہیں تھا، گویا ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہوئی تھی۔ استخوانی چہرے کے نقوش گواہی دیتے تھے کہ وہ چہرہ کبھی پُرکشش رہا ہوگا... لیکن اب بھوک، عسرت اور پریشانی نے اسے مسخ کر دیا تھا۔ اس تباہ حالی کے باوجود اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں، وہ آنکھیں اس عالم میں بھی کسی بھی شخص کو مسحور کر لینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ ان میں بلا کی چمک تھی۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جھیل کے آئینے میں ستاروں کے رقص کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ وہ نیلی آنکھیں اس کی خوب صورت خانہ بدوش ماں کا تحفہ تھیں۔

لڑکی کا نام تانیا تھا، وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اس کی ماں ایک خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتی تھی، بائیس سال کی عمر میں وہ ایک شہری بابو کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور اس نے اس محبت کے لیے خود کو تج دیا۔ نگر نگر گھومنے والے پنچھی نے پنجرہ قبول کر لیا... کیوں کہ اس پنجرے کی تیلیاں محبت کی دھات سے بنی تھیں۔ شہری بابو کی محبت نے ہواؤں کی طرح آزاد اس بلبل کو سدھا لیا۔ اس نے رانی کو عزت کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہ کرایا۔ رانی بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی لیکن بنجاروں والی فطرت اس کی محبت اور وفا کے لیے بہت بڑا امتحان بھی تھی۔ کبھی کبھی گھر کی چار دیواری میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ کھلے میدانوں، وادیوں اور پربتوں پر قلانچیں بھرنے والی ہرنی تھی، رقص و نغمہ کی محبت اس کے لہو میں شامل تھی وہ بے چین ہو جاتی، لیکن اس کے پیروں میں محبت کی زنجیریں تھیں۔ پھر اس نے یہ نکتہ پا لیا کہ زنجیر اور پایل میں کتنا ہی فرق ہو، جھنکار دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔ جب بھی گھٹن حد سے گزرتی، وہ ناچتی۔ اتنا ناچتی کہ تھک کر گرے بغیر نہ رہتی... وہ بنجاروں کے گیت گاتی، یہاں تک کہ اس کی بے چین روح آزادی سے سرشار ہو جاتی۔ ننھی تانیا حیرت سے اسے دیکھتی اور کبھی کبھی اس کی تقلید میں خود بھی تھرکنے لگتی۔ ایسے میں رانی اُسے بڑے پیار سے سمجھاتی کہ اس کا باپ ناراض ہوگا، اور یہ کہ عزت دار لوگوں کی بیٹیاں نہیں ناچتیں۔ باپ کی ناراضی ننھی تانیا کو گوارا نہیں تھی۔ اتنی محبت کرنے والے باپ کو بھلا کون ناراض کر سکتا ہے۔

تانیا کے باپ نے رانی کو تعلیم کی اہمیت سمجھائی اور تانیا کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ تانیا کی مثالی تربیت کرنا چاہتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور گھر داری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جلد ہی تانیا اپنی ماں کے برعکس سینے پرونے میں طاق ہو گئی۔ وہ شروع ہی سے کم سخن اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ماں باپ کی محبت کی صورت میں اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی۔

اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ صرف سات سال کی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی محبت اور شفقت سے محرومی کے ساتھ اپنی ماں کو اجڑتے دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔ ماں گھنٹوں بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی، اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بس اسے ایک ہی بات یاد رہتی تھی۔ صبح سویرے وہ تانیا سے کہتی کہ اسکول جاؤ۔ بے حد اصرار سے محبت سے اسے تیار کرا کے اسکول بھیجتی۔ اب شاید اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کے مشن کی تکمیل تھا۔ تانیا اس وقت تک گزر بسر کے مفہوم سے نا آشنا تھی اور سر چھپانے اور پیٹ بھرنے کا مفہوم سمجھتی تھی، وہ صرف باپ کی محبت سے محرومی کے فرق کو سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک باقی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ جیسے جیسے ماں کے بدن سے زیورات اُترتے جا رہے ہیں، اس کے چہرے اور پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس نے ماں کو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کا تاثر تھا۔ پھر جیسے گھٹن حد سے بڑھ گئی۔ اس روز وہ عرصے کے بعد ناچی... ناچتی رہی اور روتی رہی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ وہ تھک کر گر گئی... اور بے چارگی کے ساتھ ... ہوئی تانیا نے پہلی بار ماں کے رقص میں دیوانگی محسوس کی تھی، اسے وہ رقص موت کا رقص لگا تھا... اس پر ماں کا رونا، وہ ماں سے لپٹ کر پوچھتی رہی کہ کیا بات ہے؟

”تو فکر نہ کر تانی... تو اسکول ضرور جائے گی۔“ ماں نے سر اٹھائے بغیر کہا لیکن تانیا کچھ نہ سمجھ سکی۔

اس روز کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ شام کے وقت رانی خود کو سفید چادر میں لپیٹ کر، تانیا کو دروازہ اندر سے بند کرنے کی ہدایت کر کے گھر سے چلی جاتی... اور اتنی دیر سے آتی کہ تانیا کو سوتے سے اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑتا۔ ماں بہت تھکی ہوئی ہوتی اور بستر پر گرتے ہی بے سُدھ ہو جاتی۔ تانیا نے کئی بار پوچھا کہ وہ کہاں جاتی ہے لیکن وہ ٹال گئی۔

ماں کہیں بھی جاتی ہو، تانیا کو یہ پتا چل گیا تھا کہ اس سے بہت فرق پڑ گیا ہے۔ محلے کے لوگ اب انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ تانیا ان نظروں کا مفہوم تو نہیں سمجھتی تھی لیکن اسے وہ نظریں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ اب اُسے صرف ایک بار کھانا ملتا تھا... ماں کے واپس آنے پر۔ ماں اپنے ساتھ کھانا لے کر آتی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں۔ لیکن ماں اتنی تھکی ہوتی اور نیند میں ہوتی کہ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ ایک دن کھانے کے بعد اس نے تانیا کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”میری تانیا کتنی کمزور ہو گئی ہے۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ یہ تو تیرے کھیلنے کے دن ہیں میری تانی... لیکن عزت سے ایک ہی وقت کی روٹی ملتی ہے میری بچی... اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ مجھے معاف کر دینا تانی۔“

تانیا کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ لیکن اس رات ماں کے سونے کے بعد وہ دیر تک ماں کو دیکھتی رہی۔ ماں بہت بدل چکی تھی۔ بھرے بھرے رخسار پچک گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے... اور جسم میں سوائے ہڈیوں کے کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک نامعلوم احساس سے تانیا کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ عزت سے ایک ہی وقت کی روٹی ملتی ہے میری بچی... اور وہ بھی بڑی مشکل سے؟ وہ سب کچھ تو نہ سمجھ سکی... لیکن کچھ کچھ سمجھ گئی۔

تانیا نے ماں سے اس کی رات کی مصروفیت کے بارے میں بارہا پوچھا لیکن ماں نے اس کے سوا کبھی کچھ نہیں بتایا کہ وہ کام پر جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ تانیا کے ذہن میں ناخوشگوار خیالات ابھرنے لگے۔ ایک دن اس نے ماں کا پیچھا کیا تو بھید کھلا۔ نمائش کے پاس ایک سرکس لگا ہوا تھا، وہاں موت کا کنواں بھی تھا، موٹر سائیکل کا ... سے پہلے دو لڑکیاں اسٹیج پر آئیں۔ ان کے پیروں میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ پھر اس کی ماں نمودار ہوئی۔ اس نے گانا سنایا۔ سازندے بھی موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں رقص کرتی رہیں۔ پھر رانی کی نظر تماشائیوں میں کھڑی ہوئی تانیا پر پڑی... اور تانیا نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا لیکن وہ بدستور گاتی رہی۔

گانا ختم کر کے وہ تانیا کی طرف آئی۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ زندگی میں پہلی بار اس نے تانیا سے سخت لہجے میں بات کی۔

تانیا کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ”یونہی امّاں... بس یونہی...“ وہ ہکلائی۔

”اب تمھیں تسلی ہو گئی ہوگی۔“ رانی کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

”امّاں... آپ یہ سب کیوں کرتی ہیں؟“

”ایک وقت کی روٹی کے لیے میری بچی۔“ رانی کے لہجے میں بیکراں شفقت اُمنڈ آئی۔ ”میں پیروں میں گھنگرو بھی باندھ سکتی تھی۔ اس صورت میں ہم خوشحال ہوتے۔ تو گلاب کے پھول کی طرح کھلی ہوئی ہوتی۔ میں اور بڑا سمجھوتا کرتی تو تیرے مستقبل کے لیے بھی بہت کچھ ہو جاتا۔ لیکن میں نے صرف ایک وقت کی روٹی اور تیری تعلیم کے لیے چھوٹا سا سمجھوتا کیا ہے تانی۔ میں تیرے باپ کی عزت ہوں اور خود کو اس سے زیادہ نہیں گرا سکتی۔ ہم خانہ بدوش لوگ جب بکتے ہیں تو لاکھ کے عوض بکیں یا ایک ٹکے کے، سودے کا احترام مرتے دم تک کرتے ہیں۔ تو گھر واپس جا میری بچی اور آئندہ کبھی یہاں نہ آنا۔ تو بھی تو اپنے باپ کی عزت ہے... ہے نا تانی۔“

تانیا کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنسوؤں نے اس کی بینائی کو دھندلا دیا تھا۔ اس پر آگہی کا پہلا دروازہ کھلا تھا... اور آگہی میں بڑی اذیت ہوتی ہے۔ وہ گھر پہنچ کر خوب روئی۔ اس نے اپنے باپ کو یاد کیا۔ اسے اپنی ماں پر پیار آ رہا تھا۔ عزت... پیٹ... سمجھوتے... وہ سوچتی رہی کہ یہ سب کیا ہے۔

جس سال اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، اسی سال ماں بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے بعد اس پر آگہی کے باقی دروازے بھی کھلنے شروع ہو گئے۔ اس وقت اس کی عمر ۱۶ سال تھی۔

شہری اور بنجارے خون کی آمیزش نے اس کی شخصیت کو متضاد بنا دیا تھا۔ عزت اس کے لیے بہت اہم تھی... لیکن اسے بے گھری اور دربدری سے خوف نہیں آتا تھا۔ اس کی فطرت میں موسیقی اور اداکاری سے محبت شامل تھی لیکن وہ دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ بے حد معصوم تھی۔ ماں کی موت کے بعد لوگوں کی مہربانی سے وہ نظریں پہچاننے کے قابل ہو گئی، پڑوس والے فضلو چاچا سے لے کر ان کے پوتے نصیر تک ہر کوئی اس کے کام آنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، لیکن عزت کے عوض! اسے ماں کی بات یاد آتی رہی۔ ایک وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

مکان کا کرایہ چڑھتا رہا... اور وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارتی رہی۔ میٹرک پاس ہونے کے زور پر اس نے ملازمت کرنا چاہی۔ لیکن اچھوتا ہونے کے باوجود اس کا استخوانی، بے رس جسم اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہا۔ یوں اسے یہ پتا نہ چل سکا کہ لڑکیوں کو صرف ملازمت کبھی نہیں ملتی۔ ملازمت کے ساتھ ایک آراستہ فلیٹ اور دیگر آسائشات بھی لینا پڑتی ہیں... ورنہ ملازمت بھی نہیں ملتی۔

پھر ایک دن مالک مکان نے نوٹس دے دیا کہ اگر وہ اس کی ہو کر رہے تو کرائے کا کوئی مسئلہ نہیں، ورنہ فوری طور پر مکان خالی کر دے۔ اس نے پلاسٹک کی ٹوکری میں اپنے دو جوڑے کپڑے رکھے اور وہاں سے نکل آئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ پھر اچانک اسے سرکس کا خیال آیا... اور وہ سرکس کی طرف چل دی۔ سرکس میں لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر اس کی رگوں میں دوڑنے

www.BooksPK.com

والا خانہ بدوش ماں کا خون مچلنے لگا۔ وہ گا سکتی تھی... وہ جانتی تھی کہ وہ بہت اچھی اداکاری کر سکتی ہے۔ وہ منیجر سے ملی۔ ماں کے حوالے سے وہ بمشکل اسے کام دینے پر رضامند ہوا۔ منیجر نے اس کے لاغر بدن اور مرجھائے ہوئے چہرے کو بہت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ بہرحال وقتی طور پر اسے تین وقت کا کھانا اور سر چھپانے کا ٹھکانا میسر آ گیا تھا۔

تانیا کو اچانک علم ہوا کہ اسے اداکاری کا شوق ہے، یہ شوق پہلی بار اس کے شعور کی سطح پر ابھر کر آیا تھا۔ اس نے خود سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیں۔ اب پہلی بار اسے شاداب جسم کی اہمیت کا احساس ہوا۔ سرکس میں عموماً اسے کسی ایکٹ کے دوران کسی مسخرے کے ساتھ اسٹیج پر بھیجا جاتا تھا... کامیڈی کرنے کے لیے۔ مسخرا اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوب ہنساتا تھا اور داد سمیٹتا تھا... لیکن تانیا کی معصومیت کبھی تماشائیوں کے دلوں کو نہ چھو سکی۔ اس پر فقرے چست کیے جاتے، پھبتیاں کسی جاتیں۔ بالآخر ایک رات منیجر نے اسے جواب دے دیا۔

"تم بالکل مرگھلی ہو لڑکی... ہڈیوں کی مالا۔" منیجر نے کہا۔ "آج بھی تماشائیوں میں سے کسی نے تمھیں کھنی مرغی کہہ کر پکارا تھا۔ مجھے افسوس ہے، لیکن اب میں تمھیں کام نہیں دے سکتا۔ کسی لڑکی کو اگر ناچنا گانا نہ آتا ہو، تب بھی کام چل سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ... خوب صورت ہو۔ تمھارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے تانیا!"

اور یہ بات سچ بھی تھی۔ تانیا کو دیکھ کر صرف رحم کا جذبہ بیدار ہوتا تھا جب کہ تماشائی کچھ اور دیکھنے آتے ہیں۔

منیجر کے جانے کے بعد تانیا نے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ عزت سے ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے لیکن تانیا کو تو بے عزتی سے بھی ایک وقت کی روٹی ملنا مشکل تھی۔ وہ تو خود کو بیچنا بھی چاہتی تو خریدار نہ ملتا۔ اس نے اپنے عکس کو سر تا پا دیکھا اور اس کا وجود مایوسی سے بھر گیا۔ اس نے اپنے کپڑے ٹوکری میں رکھے اور ٹوکری لے کر باہر نکل آئی۔ باہر اس کی ساتھی لڑکیاں موجود تھیں۔ شاداب جسموں والی وہ حسین لڑکیاں چہک رہی تھیں۔ وہ اسٹیج پر جاتی تھیں تو لوگ انھیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ یہ بات نہیں کہ تانیا کو اپنی آمد پر سیٹیاں سننے کی آرزو تھی۔ بات اتنی سی تھی کہ وہ سیٹیاں زندگی کی... روزگار کی علامت تھیں۔ ان کے بغیر کوئی لڑکی... بے سہارا لڑکی صرف موت کی آرزو کر سکتی تھی... اس کی طرح۔

وہ ساحل کی طرف چل دی... اپنی باسکٹ اٹھائے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر وہ مایوسی تھی، جو صرف موت کی طرف بڑھنے والوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔

منیجر نے اسے دیکھا... اور اس کا دل رحم کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اسے وہ ایک ننھی سی بچی لگی، جو چاند کی آرزو کر رہی تھی... لیکن اس کے سامنے کھلونے ٹوٹ چکے تھے۔ منیجر کا جی چاہا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔ لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ دنیا قابلِ رحم لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ انسان کس کس پر رحم کھائے لیکن وہ جانتا تھا کہ اس معصوم لڑکی میں ایک بے نام کشش موجود ہے... لیکن وہ کشش ہر ایک کو محسوس نہیں ہو سکتی۔ کم از کم سرکس کے تماشائیوں کو ہرگز محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کچھ اور ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

"تانی... اے تانی! یہاں آؤ۔" اس نے پکارا... لیکن ہچکچاہٹ کے ان لمحوں میں تانیا خاصی دور جا چکی تھی۔ منیجر نے کندھے جھٹکے اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔

★★

تانیا ساحل کی طرف بڑھتی رہی... اس ارادے کے ساتھ کہ اس کے قدم گہرے پانی میں بھی نہیں رکیں گے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ دیکھ کچھ نہیں رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جیتے جی مر چکی ہے... اور اب مرنے کی محض رسم پوری کرنے جا رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں اپنی ماں کا تھکا تھکا چہرہ ابھرا۔ پھر اسے اسکول کی سہیلیاں یاد آئیں۔ گزرا ہوا وقت... باپ کی محبت اور خوشحالی و بے فکری کا دور۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے زندگی کی دیوار میں اچانک... دروازہ کھول دیا ہے اور وہ ماضی کے چمن زار میں داخل ہو گئی ہے، جہاں رنگا رنگ مہکتے پھول ہیں... لمحوں کے پھول... اور ان پھولوں پر تھرکتی ہوئی تتلیاں ہیں... یادوں کی تتلیاں۔ وہ سب یاد کرتی رہی... اور زندگی سے دور ہوتی، موت کی طرف بڑھتی رہی۔ ماضی کا حسن اپنی جگہ... لیکن ناکامی کی راکھ سے کبھی زندگی کے گھروندے تعمیر نہیں کیے جا سکتے۔ اس کا زادِ سفر صرف خوشگوار یادیں ہی تو تھیں۔

کلفٹن کے میلے کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں، لیکن چاندنی نے رات کے سیاہ دل کو منور کر رکھا تھا۔ اچانک کسی نے باریک چیختی آواز میں پکارا۔ "اے لڑکی... باسکٹ والی۔ تم کہاں جا رہی ہو... اور اتنی جلدی کیا ہے؟"

تانیا کے قدم رک گئے۔ وہ بری طرح چونکی۔ مخاطب اسی کو کیا گیا تھا... لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ درحقیقت اسے بہت زور کا غصہ آیا تھا۔ وہ آواز اسے اس اذیت ناک دنیا میں واپس کھینچ لائی تھی جس سے وہ اپنا ہر شعوری ناتا توڑ چکی تھی۔ اس آواز نے اس کا راستہ کھوٹا کیا تھا۔

اس نیم تاریکی میں دوسرے جملے نے اسے بُری طرح دہلا دیا۔ "سمندر کی تہ میں بہت سردی ہو گی لڑکی... اور خونخوار مچھلیاں تمھارا سارا گوشت نوچ لیں گی۔ وہ تمھاری خوب صورت آنکھیں بھی نوچ کر کھا جائیں گی۔" وہی باریک، سماعت میں اترتی ہوئی آواز سنائی دی۔

شاید یہ خانہ بدوش ماں کے خون کا اثر تھا کہ وہ بہت توہم پرست تھی اور ارواح پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا کہ بولنے والے کو کھوج سکے۔

کچھ دور پیٹرومکس کی روشنی میں اسے پُتلی تماشے کا اسٹال نظر آیا۔ پیشانی پر تحریر تھا مفلس خان اور اہلِ خانہ۔ اسٹال کے سامنے والے حصے میں چار فٹ کی بلندی پر ایک اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر باقاعدہ تھیٹر جیسا پردہ بھی تھا۔ پردہ اس وقت اطراف میں سمٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر خانہ بدوش نجومی کا اسٹال تھا، جہاں دو خانہ بدوش میاں بیوی آپس میں شاید پیسوں کے لیے تکرار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی کولڈ ڈرنک کا اسٹال تھا۔ اس کے سامنے مشروبات سے بھری ہوئی اور خالی بوتلوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کھڑا تھا... اور دو آدمی شاید بوتلوں کے کریٹ تبدیل کر رہے تھے لیکن تانیا نے محسوس کیا کہ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے۔ پھر وہ آواز کہاں سے آئی تھی؟

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ چیختی ہوئی آواز پھر ابھری۔ "[illegible] قیامت ٹوٹ پڑی ہے، محبوب نے دھوکا دے دیا ہے کیا؟ اگر ایسا ہے تو غم مت کرو، اور بہت مل جائیں گے۔"

اس بار تانیا نے دیکھ لیا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پُتلی تماشے والے اسٹال کے اسٹیج پر ایک پُتلی موجود تھی۔ وہ بھورے بالوں اور بھوری آنکھوں والا ایک لڑکا تھا، جو اُسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کا تاثر تھا۔ تانیا کو کم از کم ایسا ہی لگا۔ پیٹرومکس کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"اے... کیا تمھاری زبان بلی کھا گئی ہے؟" وہ پھر چیخا۔ "تمھیں آداب نہیں آتے۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتیں۔"

تانیا ڈر گئی۔ اس نے باسکٹ زمین پر رکھ دی۔ چند لمحوں میں اس کی حالت معمول پر آئی تو اس نے اپنی باسکٹ اٹھائی اور اسٹال کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹال کے بہت قریب پہنچ کر اس نے اس مختصر مخلوق کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اسے توہین کا احساس ہونے لگا۔ پُتلی نے کس قدر اہم کام میں مداخلت کی تھی۔

"آداب کی بات کرتے ہو تم۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "ذرا یہ تو بتاؤ کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا بدتمیزی ہے یا نہیں!"

پُتلی نے بے حد محتاط انداز میں اسے سر تا پا دیکھا۔ "اوہ، بے روزگاری سے تنگ آ چکی ہو، اسی لیے اس قدر تلخ ہو رہی ہو لی لی، میں نے یونہی ہمدردی میں تمھیں پکار لیا تھا۔ بور ہو رہا تھا، سوچا، تمھارے ہی ساتھ کچھ وقت گزارا جائے۔"

"واہ بھئی واہ... جان نہ پہچان، خواہ مخواہ بے تکلف ہوئے جا رہے ہو۔" تانیا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور یہی نہیں... ذاتیات پر بھی گفتگو کر رہے ہو۔ اگر میں بھی تم سے کچھ نوعیت کے......"

اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک بے جان کٹھ پتلی سے ہمکلام ہے... ایسے، جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان ہو لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ جس صورتِ حال سے دوچار تھی... اور جو اس کی ذہنی کیفیت تھی، اس کے پیشِ نظر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لکڑی کے اس پتلے کے چہرے پر ماہرانہ انداز میں رنگ کیا گیا تھا۔ اس کا سر ذرا اِدھر اُدھر ہٹتا تو ایسا لگتا کہ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا ہے۔ تانیا نے کبھی کٹھ پتلی کا تماشا دیکھا بھی نہیں تھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" کٹھ پتلی نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "تعارف بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ مجھے تو اپنے بارے میں گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے۔ میری جیون کہانی سنو گی۔ میرا نام ہیرو ہے اور میں صنوبر کے تنے میں پیدا ہوا تھا..."

تانیا کو آہٹ سی محسوس ہوئی... اور دوسرے ہی لمحے ایک نسوانی پُتلی اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ سنہرے بال اس کے شانوں پر جھول رہے تھے۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں حیرت اور تجسس تھا۔ چھوٹا سا دہانہ اور بھرے بھرے خوب صورت ہونٹ...

اس نے کئی بار سر اٹھایا اور جھکایا... گویا تانیا کا معائنہ کر رہی ہو۔ پھر اس نے مرد پُتلی سے کہا۔ "خدا کی پناہ... ہیرو، یہ تمھیں کہاں مل گئی؟"

ہیرو نے فخر آمیز لہجے میں پوچھا۔ "اچھی ہے نا؟"

"خدا کی پناہ ہیرو... باؤلے ہو گئے ہو کیا؟" لڑکی کی باریک آواز میں حیرانی تھی۔ "تمھارے خیال میں یہ خوب صورت ہے! اسے... ہڈیوں اور کھال کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

ہیرو نے سر جھکا اور تانیا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "چپلا!... میں مانتا ہوں کہ یہ لڑکی بہت لاغر ہے۔ لیکن دیکھو تو سہی، اس کی آنکھیں کتنی بڑی بڑی اور خوب صورت ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک ایسی خوب صورتی بھی ہے، جسے میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن تمھیں سمجھا نہیں سکتا۔"

www.BooksPk.com

"مجھے تو یہ بالکل گنوار لگتی ہے۔" چمپا نے بے حد خراب لہجے میں کہا اور منہ یوں آسمان کی طرف اٹھایا، جیسے خدا سے فریاد کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کا تاثر تھا۔

"گنوار تو نہیں البتہ گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی لگتی ہے۔" ہیرو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی، مجھے تو...."

اب بات تانیا کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ بے حد خود دار لڑکی تھی۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلائی۔ "تم دونوں اپنی جرأتیں تو دیکھو۔ میرے سامنے کھڑے مجھ پر کس دیدہ دلیری سے تبصرے کر رہے ہو، غضب خدا کا.... کچھ دیر پہلے تم ادب اور تمیز کی باتیں کر رہے تھے۔ کیا یہ بدتمیزی نہیں ہے جو تم کر رہے ہو؟"

ہیرو نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا اور فکر مند نظر آنے لگا۔

"میرا خیال ہے، تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟" اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "ان دنوں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی بدتمیز اور منہ پھٹ ہو گئے ہیں۔ شاید ہمیں گوشمالی کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ تم ہمارے سامنے ذرا ڈھنگ کی ڈانٹ ڈپٹ کر دو۔"

"میں باز آئی۔ کوؤں کو ڈرانے والی پتلی سے ڈانٹ ڈپٹ سننا میرے بس سے باہر ہے۔ میں چلی۔" چمپا نے اترا کر کہا اور غوطہ لگا کر غائب ہو گئی۔

ہیرو نے بڑی افسردگی سے سر ہلایا اور بولا۔ "چمپا کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ غرورِ حسن بھی بہت بُری چیز ہوتی ہے۔ خیر.... تم ڈانٹ ڈپٹ کرو نا۔ میں اپنی توہین کا بڑی بے چینی سے منتظر ہوں۔ میں جب کوئی غلط کام کرتا ہوں تو اس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار رہتا ہوں۔"

تانیا کے لبوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ اُبھری۔

"نہیں.... میں تمھاری توہین نہیں کروں گی۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا.... کیا سچ کہہ رہی ہو؟" ہیرو خوش نظر آنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے، مجھے کچھ سوچنا چاہیے۔ سنو.... میں تم سے پھر ملوں گا۔" یہ کہہ کر وہ بھی غائب ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی ایک لومڑ پتلی نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ سُرخ، ناک نکیلی تھی اور باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی اور آواز اور لہجے میں عیاری کا تاثر آنکھوں سے بھی زیادہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے پھاڑ کھانے والے انداز میں تانیا کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہیلو پیاری لڑکی!"

تانیا نے اسے بُری طرح گھورتے ہوئے کہا۔ "اے.... مجھ سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم صورت ہی سے چالاک اور اچکے نظر آتے ہو۔"

لومڑ نے سر گھمایا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اسے اس تبصرے سے دلی تکلیف پہنچی ہو۔ "میں ایسا نہیں ہوں۔" اُس نے زخمی لہجے میں کہا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں، میری صورت ہی ایسی ہے۔ یہاں آؤ میں تمھیں سمجھاؤں۔ ذرا اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔"

تانیا اسٹال کے اور قریب ہو گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ لومڑ کی طرف بڑھایا۔ انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ کچھ فکرمند نظر آ رہی تھی.... لیکن تجسس نے بہرحال اسے مجبور کر لیا تھا۔

لومڑ نے اپنی ٹھوڑی اُس کی ہتھیلی کے پیالے میں رکھ دی، پھر وہ ٹھوڑی سے اس کی ہتھیلی کو سہلانے لگا۔ "دیکھو.... تم مجھے کس قدر غلط سمجھ رہی تھیں۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں، ازل سے۔ میری صورت ہی ایسی ہے کہ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

تانیا اُس عیار لومڑ کی باتوں میں آنے والی کہاں تھی، جھٹ بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ میں تمھیں غلط سمجھی تھی۔ میں تم جیسوں کو خوب جانتی ہوں۔"

"نہیں.... تم نہیں جانتیں۔" لومڑ نے اصرار کیا۔ وہ اب بھی اس کی ہتھیلی کو ٹھوڑی سے سہلا رہا تھا۔ "میں دل کا بہت اچھا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھ پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ تم مجھ پر اعتبار کرو گی؟ کرو گی نا؟"

تانیا جواب دینے والی تھی کہ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے، اسی وقت لومڑ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ یقیناً [illegible] اور رقص کرتے ہوئے سایوں کا کرشمہ رہا ہو گا، لیکن کم از کم تانیا کو ایسا لگا، جیسے لومڑ کی آنکھوں میں ایک تڑپ سی اُبھر آئی ہے.... اس کے چہرے پر التجا کا تاثر ہے، جیسے وہ کہہ رہا ہو.... خدا کے لیے، مجھ پر اعتبار کر لو۔ میں اس نعمت کو ترس رہا ہوں۔ میں تمھیں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔ اس احساس نے تانیا کے معصوم دل کو چھو لیا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "ہاں.... میں تم پر اعتبار کروں گی۔" اس کے لہجے میں بے پایاں خلوص تھا.... سچائی تھی۔ وہ بھول گئی کہ کن حالات سے دوچار ہے.... اور کس ارادے سے ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ اسے تو جیسے کسی اَن دیکھی ڈور نے باندھ لیا تھا.... کٹھ پتلیوں ہی کی طرح۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ پتلی تماشے کے اسٹال پر.... اسٹیج کے قریب کھڑی ایک لومڑ پتلی سے بات کرتی ہوئی کتنی عجیب لگ رہی ہو گی۔ جانوروں سے، پرندوں سے، درختوں سے اور پانی کے بہتے ہوئے چشموں سے محبت کی خو اسے اپنی خانہ بدوش ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ اپنے دل کے بھید.... اپنے وجود کے راز اُس پر آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن مجھے ایک بے حد معصوم لڑکی مل جائے گی۔" لومڑ نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "بی بی، تمھارا نام کیا ہے؟"

"تانیا۔"

"خوب صورت نام ہے۔" لومڑ نے تبصرہ کیا۔ "مجھ سے ملو۔ میرا نام چالباز ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ سے عمر بھر شکایت رہے گی کہ انھوں نے میرا اس قدر نامعقول نام رکھا تھا۔ بتاؤ، اس نام کے ہوتے ہوئے کوئی مجھ پر اعتبار کر سکتا ہے... کوئی مجھ سے محبت کر سکتا ہے؟"

"واقعی... تمھارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔" تانیا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

لومڑ نے سر اٹھایا۔ اس کا سر ایسے زاویے پر تھا کہ وہ تانیا کو کن انکھیوں سے دیکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ "تم کہاں کی رہنے والی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کراچی کی... میری ماں خانہ بدوش تھی۔" تانیا نے جواب دیا۔

لومڑ کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہرا گئی۔ "کتے سے اس وقت ہوشیار رہو، جب وہ سو رہا ہو۔" اس نے شریر لہجے میں کہا۔ "شرابی سے اس وقت ڈرو، جب وہ دعا مانگ رہا ہو۔ لیکن خانہ بدوشوں کے روبرو ہر وقت چوکنا رہو۔ بزرگوں نے کہا ہے..."

"غضب خدا کا... یہ بات لومڑ کہہ رہا ہے۔" تانیا نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "بزرگوں نے کہا ہے کہ جب کوئی لومڑ واعظ بننے کی کوشش کرے تو سمجھ لو کہ تم لٹنے والے ہو۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

چالباز نے زوردار قہقہہ لگایا اور اسٹیج پر دائیں جانب کھسک گیا۔ "بے بی... دیکھنے میں تو تم ڈھانچہ لگتی ہو... لیکن اس ڈھانچے میں حوصلہ بھی ہے اور جاندار روح بھی۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا اور پھر سر جھکا کر تائید طلب انداز میں بولا۔ "کیوں دوستو... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" وہ ان دو ٹرک والوں سے مخاطب تھا، جو بوتلوں کے کریٹ اتارنے چڑھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" ان میں سے ایک نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

چالباز نے پھر قہقہہ لگایا اور اسٹیج کے عقب میں کسی کو پکارا۔ "رستم... اے رستم، یہاں آؤ۔ دیکھو... تم اسے ڈرا سکتے ہو یا نہیں۔"

اسی لمحے اسٹیج پر ایک دیو قامت پُتلا اُبھر آیا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ تانیا کو گھورنے لگا۔ جواباً تانیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

چالباز نے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ ہے ہمارا شہ زور رستم... اور رستم، یہ لڑکی تانیا ہے۔ یہ مجھ پر مر مٹی ہے۔"

تانیا اس بات کی تردید کرنے والی تھی لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ دیکھا جائے، کیا ہوتا ہے۔

دیو قامت رستم بدستور تانیا کو گھور رہا تھا، پھر جیسے وہ ذہن پر زور ڈالنے لگا۔ "کھشو مکاشا... تن... نہیں... مکھو کناشا... نہیں... یہ بھی نہیں۔" پھر وہ اپنے سر پر ہتھوڑا مار کر بولا۔ "ہمیشہ بھول جاتا ہوں، خدا جانے کیا مصیبت ہے۔"

تانیا کو ایک پرانی فلم یاد آ گئی، جس میں ایک دیو کا یہ تکیہ کلام تھا... "نکھشو مکاشا۔" اس نے رستم کو یاد دلایا۔

"ہاں... نکھشو مکاشا۔" رستم نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ "نکھشو مکاشا... میں ایک دیو ہوں۔ لیکن..." اچانک وہ مایوس نظر آنے لگا۔ "...لیکن فائدہ کیا ہے، تم مجھ سے ڈر ہی نہیں رہی ہو۔"

تانیا نے بڑی معصومیت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گویا دھڑکنیں چیک کیں پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے... لیکن مجھے واقعی تم سے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔"

"افسوس [illegible]" رستم نے [illegible] لہجے میں کہا۔ "یہ ڈرانے کا کام تو مجھ پر ٹھونس دیا گیا ہے۔ ورنہ میں تو دوست بنانا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے سر میں بہت خشکی ہو گئی ہے۔ کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ تم میرا سر کھجا دو گی اچھی دوست؟"

تانیا نے بڑی محبت سے اس کا چوبی سر سہلانا شروع کر دیا۔ رستم غنودہ لہجے میں واہ واہ کرنے لگا۔ اس کے اس بچکانہ انداز نے تانیا کے دل کو چھو لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اسے اس کے مطلب کے لوگ مل گئے ہوں۔ ناکامی اور مایوسی کا احساس دھل گیا تھا۔

دفعتاً چالباز سر جھکاتے ہوئے چلایا۔ "میرا سر بھی سہلاؤ۔ میرا سر بھی..." انداز اس بچے کا سا تھا، جسے خود کو نظر انداز کیا جانا بُرا لگتا ہو۔ پھر اس نے تانیا کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اچانک ایک کھٹارا سی وین کٹھ پتلیوں کے اسٹال کے سامنے آ کر رکی۔ اس کا پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے ایک بد ہیئت شخص اترا اور وین کے پچھلے حصے سے ایک بڑا ٹرنک اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ [illegible] ایک جسیم، بھاری بھرکم اور پستہ قامت آدمی تھا۔ اس کا جبڑا یوں

سے بھرا ہوا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔ سونے کے دانتوں کی بتیسی بتاتی تھی کہ اس نے کبھی بہت اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے۔ اس کی خراب آنکھ پر میلا چیکٹ غلاف تھا، جس کی وجہ سے وہ بہت خوف ناک لگ رہا تھا۔ حالاں کہ اس کے گول مٹول چہرے پر، جو اس کے گول مٹول جسم سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، بلا کی معصومیت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ تھی۔ قمیص کی جیب میں ایک ماؤتھ آرگن رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے اسٹیج پر دزدیدہ نظر ڈالی اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ "اوہ... چالباز، اس بار تم نے کیا چکر چلایا ہے۔ تمھیں تو بس موقع ملنا چاہیے۔ تمھیں دو منٹ اکیلا چھوڑ دوں تو تم اتنی دیر میں کسی نہ کسی لڑکی کے چکر میں پڑ جاتے ہو۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو گولو۔" چالباز نے اسے ڈانٹ دیا۔ "اور ہاں... شام کو جب تم تماشے کے بعد پیسے سمیٹ رہے تھے تو تم نے نظر بچا کے ایک اٹھنی جیب میں ڈال لی تھی، نکالو اٹھنی۔"

گولو نے ستائشی نظروں سے لومڑ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار چالباز... تم بہت تیز ہو، سب کچھ دیکھ لیتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے اٹھنی نکال کر اسٹیج پر پھینکی۔

لومڑ تیزی سے اٹھنی کی طرف لپکا۔ "دیکھا تم نے۔" اس نے تانیا سے کہا۔ "یہاں ایک میں ہی ایمان دار ہوں۔ باقی سب ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں۔ بدنام ہو گیا ہوں۔" پھر وہ گولو کی طرف مڑا۔ "گولو... یہ لڑکی میری دوست ہے۔ اس کا نام تانیا ہے۔ ہم دونوں شادی کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ اور تانیا... یہ گولو ہے... ہمارا میوزک ڈائریکٹر۔"

تانیا نے گولو کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ جواباً گولو نے سر خم کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلیوں کو یوں چوما جیسے وہ کوئی شہزادی ہو۔

"اے گولو... یہ کیا حرکت ہے۔" چالباز نے گولو کو ڈانٹا۔ "تم تو میری منگیتر کا دماغ خراب کر دو گے۔ ہٹو ایک طرف۔" پھر وہ تانیا سے مخاطب ہو گیا۔ "بے بی... ایک بات بتاؤ، تمھیں گانا آتا ہے؟"

"رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔" تانیا نے جواب دیا۔ "تم بھی گاتے ہو؟"

"ارے... یہ کیا پوچھ لیا تم نے؟ میں اس ملک کا سب سے بڑا گلوکار رہا ہوں۔ ایک بار میں نے گانے کے زور سے مہدی حسن کا تانپورہ توڑ دیا تھا۔ میرا ایک دوست بھی گلوکار ہے۔ تمھیں ملا

کر [illegible] بن جائے گی۔ اے رستم... ذرا راگی کو بھیجو اور گولو... تم کوئی اچھی سی دھن بجاؤ ہمارے لیے۔"

رستم اسٹیج سے غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ ایک ننھی چڑیا ابھر آئی، جس کا اوپری حصہ کسی بلبل سے مشابہ تھا۔ "یہ ہے میرا دوست گویا راگی۔" چالباز نے تعارف کرایا۔ "یہ بھی اس اکیڈمی کا ممبر ہے۔"

بلبل نما چڑیا نے بڑی ادا سے سر کو خم کیا اور مترنم آواز میں بولا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی تانیا۔"

گولو نے ماؤتھ آرگن منہ سے لگایا... اور اگلے ہی لمحے فضا میں سحر انگیز موسیقی گونجنے لگی۔ وہ ایک جانی پہچانی دھن تھی۔ تانیا بلا ارادہ گانے لگی۔ "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے...... قدم قدم آباد۔" اس فضا نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ اپنی تمام بربادی بھول گئی تھی... اور سوہنی دھرتی کو آبادی کی دعا دے رہی تھی۔ اس کی آواز بہت اچھی اور منجھی ہوئی نہیں تھی تاہم اس میں غیر معمولی نرمی اور روح کی سچائی سے ابھرنے والی نغمگی بے حد واضح تھی۔ چالباز اور راگی اس کی آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ "تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا۔"

اس نغمے کے دوران تانیا کھو سی گئی۔ وہ اُن وادیوں اور مرغزاروں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جنھیں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ بے حد خوب صورت تھا۔ زندگی بے حد خوب صورت تھی... اور سمندر کی تہ میں موت کی تاریکی تھی... تیز نوکیلے دانتوں والی خونخوار مچھلیاں تھیں۔

نغمے نے اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ خانہ بدوش نجومی میاں بیوی اپنا جھگڑا بھول کر اسٹال پر چلے آئے تھے اور اب تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں اتری ہوئی چاندنی نے انھیں بے حد روشن بنا دیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور دونوں مزدور بھی آ کھڑے ہوئے تھے... اور تال ملا رہے تھے۔ ساحل سے مزار کی طرف جانے والی ایک خالی ٹیکسی کے ڈرائیور نے گاڑی روک دی تھی اور اسٹال کی طرف چلا آیا تھا۔ ساحل کی طرف سے آنے والے کچھ لوگ بھی آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بچے بھی تھے، جو مسحور ہو کر پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں کافی تماشائی اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ سب مسحور ہو کر پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ تماشا ان کے لیے نیا نہیں تھا... لیکن تماشے میں وہ اضافہ انھیں پسند آیا تھا، جو بے حد خوبصورت لگ رہا تھا... وہ دبلی پتلی لڑکی جو ان کی موجودگی سے بے خبر، یوں معصومیت سے کٹھ پتلیوں میں الجھی ہوئی تھی، جیسے وہ انھی میں سے ایک ہو۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی۔ وہ ایک

www.BooksPK.com

جیتی جاگتی اور نسبتاً بڑی کٹھ پتلی معلوم ہو رہی تھی۔

اس مختصر سے وقفے میں تانیا کا وجود ایک بڑی کیمیائی تبدیلی سے گزر رہا تھا۔ مایوسی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ محرومی کا احساس ہٹ گیا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں گنگنا رہی تھی۔ گنگناتے کے دوران کبھی وہ چالباز کی طرف دیکھتی اور کبھی راگی کی طرف۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کے پھول کھل رہے تھے۔

نغمہ ختم ہوا تو تماشائیوں نے تالیاں بجا کر انھیں بے ساختہ داد دی۔ لیکن تانیا کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ گوگو کاسہ لے کر تماشائیوں کے پاس گیا ہے... اور وہ اس کاسے میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سکّے ڈال رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے نوٹ بھی دیے تھے۔ وہ تو بس چالباز اور راگی کو دیکھے جا رہی تھی، جو تماشائیوں کی داد و تحسین کے جواب میں جھک جھک کر گویا آداب بجا لا رہے تھے۔

”آج تو تم نے کمال کر دیا چالباز۔“ راگی نے لومڑ کو داد دی۔ ”آج تمھاری آواز پر غضب کا نکھار تھا۔“

”اور تمھاری تعریف کرنے کے لیے مجھے الفاظ ہی نہیں مل رہے ہیں میرے دوست۔“ چالباز نے جواباً داد دی۔ پھر وہ تانیا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں تم میں ایک فنکار چھپا دیکھ رہا ہوں۔“

تانیا کا دل شکر گزاری اور فخر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اُس کی پذیرائی ہوئی تھی... اُس کی فنکارانہ صلاحیت کو داد دی جا رہی تھی۔

”میری بی، تمھاری آواز میں ایک انوکھی کشش ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ تم خود اس سے ناواقف ہو... اور اپنی آواز کو استعمال کرنا نہیں جانتیں۔“ راگی نے کہا۔

اسٹیج کے نیچے کہیں گھنٹی بجی۔ ”اوہ... کھانے کا وقت ہو گیا۔“ چالباز نے چیخ کر کہا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی بے بی۔ پھر ملیں گے۔ آؤ راگی چلیں۔“

وہ دونوں نیچے غوطہ لگا گئے۔ گوگو چند لمحے تانیا کو اپنی اکلوتی آنکھ سے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھ میں گہری اداسی تھی... صاف پتا چلتا تھا کہ اس آنکھ نے ایک دنیا دیکھی ہوئی ہے۔

”بی بی... تم کون ہو؟“ بالآخر اس نے پوچھا۔

”میں... میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔“ تانیا نے گڑبڑا کر کہا۔

”تم ہمارے لیے خوش بختی لائی ہو۔“

”واقعی؟“ تانیا خوش ہو گئی۔ ”مجھے تو خوشی ہوئی یہ سن کر... لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تو خود بدنصیب ہوں۔“ یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گئی۔

”نہیں... تم بدنصیب نہیں ہو۔“ گوگو نے اصرار کیا۔ ”معصومیت کبھی بدنصیب نہیں ہوتی کیوں کہ بدنصیبی تو محض ایک حادثہ ہوتی ہے۔ اب تم کہاں جاؤ گی بی بی؟“

”معلوم نہیں۔“ تانیا نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ گوگو کے اس سوال نے اسے سب کچھ یاد دلا دیا۔ وہ کہاں جا رہی تھی... کہاں جانا تھا اسے؟ ہاں... اسے تو جانا تھا۔ پریوں کی کہانی ختم ہوئی... جشن کی رات تمام ہوئی۔ اب پھر سنگین مسائل کی دوپہر سر پر تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں، اس ننھے کی گوگو... کٹھ پتلیوں سے اس کی گفتگو کی بازگشت دل میں اب بھی موجود تھی۔ وہ پریشانی کے باوجود خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

گوگو نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ لڑکی کے چہرے پر جو تاثر تھا، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ بے گھری کے کرب سے آشنا تھا۔ وہ کرب تو اس کی روح کی گہرائیوں میں رچا ہوا تھا لیکن جو شخص اپنے دُکھ کا مداوا نہ کر سکے، وہ دوسرے کے دُکھ پر متاسف ہونے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ ”معاف کرنا بی بی... اب مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔ ہم آج یہاں سے جا رہے ہیں نا۔“ اس نے کہا اور دری سے اٹھاتے ہوئے صندوق کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت تانیا کو اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اسٹیج پر ایک اور پتلی نمودار ہو گئی تھی۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی، جس کے بالائی ہونٹ کے اوپر رُواں اس قدر بھاری تھا کہ اس نے مونچھوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کی بھنویں [illegible] وہ اسٹیج کی صفائی کر رہی تھی۔ تانیا کے پلٹتے ہی اس نے تانیا کو بغور نیچے سے اوپر تک دیکھا اور مدھم آواز میں سرگوشی کی۔ ”ان میں سے کسی پر اعتبار نہ کرنا۔“

وہ سرگوشی تانیا کو پھر حقائق سے دُور، پتلیوں کی دنیا میں لے گئی۔ ”کس پر اعتبار نہ کروں؟“ اس نے پوچھا۔ لہجے میں حیرت تھی۔

”کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا۔“ عورت نے پھر سرگوشی کی۔ ”میں عورت ہوں۔ میں نے عمر گزاری ہے... دنیا دیکھی ہے۔ یقین کرو، میں تمھیں صحیح مشورہ دے رہی ہوں۔“

”لیکن وہ سب اتنے مہربان اور نرم دل ہیں...“ تانیا نے احتجاج کیا۔

”ہونہہ... یہ سب ان کے ہتھکنڈے ہیں۔ میں بُوا تمیزن ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔ ان میں سے ایک ایک کو پہچانتی ہوں۔ تم مجھے عزت دار لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ میری بات مانو اور یہاں سے کھسک لو۔ یہ سب بہت بُرے لوگ ہیں۔ تمھیں نقصان

پہنچ سکتا ہے۔“

تانیا نے بُوا تمیزن کو غور سے دیکھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کو اپنے محلے کی زرینہ خالہ یاد آ گئیں۔ وہ جب بھی آتی تھیں، اِدھر اُدھر کی خبریں لاتی تھیں۔ لوگوں کی برائیاں کرنا اُن کا مشغلہ تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ماں ہمیشہ کہتی تھی۔ ”اُن کی بات پر کبھی اعتبار نہ کرنا تانی۔ انھیں دوسروں کی برائی کرنے کی عادت ہے۔ یقین کرو، یہ دوسروں کے گھر جا کر ہماری بُرائی کرتی ہوں گی۔ خدا جانے... عورتوں میں یہ مرض اتنا کیوں ہوتا ہے...“ اور تانیا ہمیشہ ماں کو یوں دیکھتی، جیسے اُس نے مرد ہونے کا اعلان کر دیا ہو۔

بُوا تمیزن کو دیکھ کر، اس کی باتیں سن کر تانیا کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی افواہیں پھیلانے کی شوقین عورتوں میں سے ہے... اور ایسی عورتوں کو اُس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ اس وقت بُوا تمیزن کی بات اُس کے دل میں اذیت بن کر چبھی تھی۔ یہ وہی اذیت تھی جو انسان عزیز ترین دوستوں کی برائی سننے پر محسوس کرتا ہے۔

وہ چلّائی۔ ”ہرگز نہیں۔ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔“

گوگو نے سر اٹھا کر اسٹیج کی طرف دیکھا اور بُوا تمیزن کو ڈانٹ دیا۔ ”بُوا تمھیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ یہ لوگ بُرے نہیں ہیں۔ بس، ذرا شریر ہیں... اور نوجوانی ہمیشہ شرارت پر اُکسایا ہی کرتی ہے۔“ پھر وہ تانیا سے مخاطب ہوا۔ ”بُوا کی باتوں پر کان نہ دھرنا بیٹی۔ ابھی میں اسے صندوق میں بند کروں گا تو یہ بکواس کرنا بھول جائے گی۔“

اس دھمکی پر بُوا تمیزن نے زوردار [illegible] ماری اور اسٹیج کے نیچے غوطہ لگا گئی۔ فوراً ہی اس کی جگہ ایک اور پتلے نے لے لی۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور صورت سے نہایت شریف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ چہرے پر دوستانہ لیکن الجھن آمیز تاثر تھا۔ اس نے سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس کی نظریں تانیا پر جم گئیں۔ تانیا کو ایسا لگا، جیسے وہ اُس کے آر پار دیکھ رہا ہے۔

”شام بخیر لڑکی۔“ اس نے بے حد مہربان لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز میں عجیب طرح کی ملائمت تھی۔ ”میرا نام عقلمند ہے... پروفیسر عقلمند۔ میں کھلونے بناتا ہوں... اور ان کا علاج بھی کرتا ہوں۔ میری بچی... میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم پریشان ہو۔ میں نے تمھاری آنکھوں کے پیچھے پوشیدہ وہ آنسو دیکھ لیے ہیں، جو تم بہا نہیں سکی ہو۔“

تانیا کا ہاتھ بے ساختہ اپنے گلے پر جا رُکا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے حلق میں کچھ اٹک رہا ہو۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ کسی نے اسے میری بچی کہہ کر نہیں پکارا تھا۔

”بی بی... پروفیسر بہت اچھا آدمی ہے۔ اسے سب کچھ بتا دو۔ یہاں ہر شخص اپنے مصائب پروفیسر کے سامنے بیان کرتا ہے۔“ گوگو نے کہا۔

تانیا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ بند ٹوٹ گیا۔ یہ اندازہ تو خود اسے بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے آنسو چھپائے بیٹھی ہے۔ وہ روتی رہی... اور گھٹی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سناتی رہی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ لکڑی کے ایک بے جان پتلے کو اپنی بپتا سنا رہی ہے۔ اس کے نزدیک تو وہ ایک مشفق بزرگ تھا، جو پوری توجہ اور گداز کے ساتھ اُسے سن رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت اور سچائی کے ساتھ اپنی زندگی اس پر کھول دی... حالاں کہ وہ یہ سب کچھ کسی انسان کو سنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک شرمناک حرکت ہوتی۔

جب وہ آنسوؤں، آہوں اور اذیتوں کی یہ داستان سنا چکی تو پروفیسر نے کہا۔ ”اور تم ان مسائل سے ڈر کر سمندر میں پناہ ڈھونڈنے جا رہی تھیں؟“

تانیا حیران رہ گئی... کیوں کہ یہ بات تو اس نے پروفیسر کو بھی نہیں بتائی تھی۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اُس نے پوچھا۔

”یہ جاننا کچھ مشکل نہیں تھا۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”لیکن لڑکی... سمندر کی تہ میں تم جیسے نوجوان اور اُمنگوں بھرے دلوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“

”لیکن پروفیسر... میں کیا کروں۔ میں کہاں جاؤں؟“

پروفیسر نے سر جھکا لیا اور کسی سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی پر مفکرانہ انداز میں ہاتھ رکھا اور سر ٹیڑھا کر کے بولا۔ ”تم ہمارے ساتھ رہو نا۔“

”آپ کے ساتھ رہوں؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ تانیا نے بے حد خوش ہو کر پوچھا۔ اس کے لیے وہ محض ایک امکان نہیں تھا بلکہ اس کے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ تو اتنی ہی دیر میں اُن لوگوں سے گھل مل گئی تھی... بلکہ ان کے لیے محبت محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ سات کٹھ پتلیاں، جو اپنے مزاج اور عادات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں... اُس کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔ اس کے تخیل نے انھیں محبت کرنے والے دردمند دوستوں کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ پتلیاں جیسے اس کے دل کی ڈور سے بندھ گئی تھیں۔ یا شاید وہ حقیقی دنیا کی سنگینیوں سے خوف زدہ ہو کر اپنے تخیل کے دامن میں پناہ لینا چاہتی تھی۔ ”اوہ پروفیسر۔“ اس نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ اس کا لہجہ چٹخ چٹخ گیا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیں گے؟“

پروفیسر چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”یہ سوال تمھیں میرے

www.BooksPK.com

پوچھنا چاہیے۔ وہی اس شو کا انچارج ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ابھی لڑکی... خدا حافظ۔"

کچھ دیر تک اسٹیج خالی رہا۔ تانیا امید و بیم کے درمیان معلق تھی پھر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی... اور اچھلتا کودتا ہیرو اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ تانیا کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ "ارے تانی... تم ابھی تک موجود ہو؟"

تانیا سوچتی اور جھجکتی رہی کہ اُس سے مطلب کی بات کیسے کہے۔ یہ تو اسے پتا چل گیا تھا کہ اُس کے مزاج کے موسم بہت تیزی سے بدلتے ہیں۔ اب اس وقت وہ پہلی ملاقات کے مقابلے میں بہت مختلف نظر آرہا تھا۔ بہرحال، بات تو کرنا ہی تھی۔ "پروفیسر کہہ رہے تھے کہ..." اس نے کہنا چاہا۔

"ہاں... میں سُن چکا ہوں۔" ہیرو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمھارے شو میں شامل ہو سکتی ہوں؟" تانیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ہیرو نے بغور اُسے دیکھا۔ وہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ "تم نے اتنے خوب صورت انداز میں پوچھا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی تمھیں دریافت تو میں نے ہی کیا تھا، ہے نا؟ تم شامل ہو سکتی ہو لیکن یہ سوچ لو کہ تم تمام وقت مجھے نصیحتوں اور مشوروں سے تو نہیں نوازا کرو گی۔ مجھے اپنی خود مختاری بہت عزیز ہے۔ اس کے علاوہ مجھ پر اس شو کے سلسلے میں بہت سی ذمے داریاں ہیں..."

"میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی۔" تانیا نے جلدی سے کہا۔

"اور تم ہمارا خیال رکھو گی؟"

"مجھے موقع تو دو..."

"ہمارے کپڑوں میں بٹن ٹانکو گی؟"

"ہاں... اور تمھارے موزوں کی مرمت بھی کروں گی۔"

"تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے پیر نہیں ہیں۔" ہیرو نے سخت لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"میں تم لوگوں کے لیے سوئیٹر بنوں گی۔"

"ہاں... یہ ہوئی نا بات۔" ہیرو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم نے سوئیٹر کبھی نہیں پہنے۔ اور ہاں... تمھیں معلوم ہے، تمھیں پیسے بھی نہیں ملیں گے۔"

"مجھے پیسوں کی کوئی پروا نہیں۔"

"تب ٹھیک ہے۔ تم ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہو۔"

"شکریہ ہیرو۔"

"شکریہ تانی... خوش آمدید۔"

تانیا کو یاد نہیں کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے اسٹیج کے بہت قریب لے گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہیرو نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں... اور اپنے چوبی ہاتھ سے اس کا رخسار تھپتھپا رہا تھا۔

"اے تانی... رو مت۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "میں تو شروع ہی سے یہ چاہتا تھا کہ تم ہمارے ساتھ رہو لیکن میں منیجر ہوں۔ مجھے اس کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ میں تو بس یونہی اداکاری کر رہا تھا۔ میں تمھیں مفلس خان اور اہلِ خانہ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

پیچھے سے چالباز کا زبردست قہقہہ سنائی دیا... پھر چھپا کی باریک چنچتی آواز... "آخر اسے ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں ہمارا پیٹ تو ٹھیک طرح سے بھرتا نہیں ہے۔"

پھر تو اتمیزن اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ "یاد رکھنا۔" اس نے سرگوشی کی۔ "میں نے پہلے ہی تمھیں تنبیہ کر دی تھی۔"

پھر رستم ابھرا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا حالاں کہ بے وقوف ہونے کی وجہ سے میری دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ سر میں بھی کھجلی ہوتی ہے..." یہ کہہ کر اس نے اپنا سر تانیا کے سامنے جھکایا...

یک لخت ہیرو مستعد ہو گیا۔ "نہیں رستم ابھی نہیں۔" پھر اس نے گولو کو پکارا۔ "گولو... گولو... کہاں ہو تم؟"

"حاضر ہوں چھوٹے باس۔" گولو چراغ کے جن کی طرح نمودار ہو کر بولا۔

www.BooksPK.com

"تانیا ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کے لیے گاڑی میں جگہ بناؤ۔" ہیرو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"دل خوش کر دیا ہیرو۔" گولو نے نعرہ لگایا۔ "مجھے یقین ہے کہ تانیا ہمارے لیے مبارک ثابت ہوگی۔ میں اس کے لیے جگہ بناتا ہوں۔"

"جلدی کرو... پھر واپس آکر سامان سمیٹو۔"

"ابھی لو چھوٹے باس۔" گولو چہکا۔ "میں ابھی سارے کام نمٹا دیتا ہوں بس، آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو ٹھکانے لگا دوں گا۔" اس نے تانیا کی باسکٹ تھامی اور اُسے لے کر گاڑی کی طرف چل دیا۔ باسکٹ اس نے وین کے عقبی حصے میں لدے ہوئے سامان کے ساتھ رکھ دی۔ عقبی حصے میں دونوں طرف نشستیں تھیں، جن پر سویا بھی جا سکتا تھا۔ دونوں نشستوں کے درمیان سامان بکھرا ہوا تھا۔ اس میں کٹھ پتلیوں کے ملبوسات، پینٹ کے ڈبے، پرانے اخبارات، کچھ برتن، پٹرول کا ایک فاضل ٹن اور نجانے کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔ وین میں اس مکان کی سی بے ترتیبی تھی، جو عورت کے دستِ نفاست سے محروم ہو۔

گولو نے سامان کو ترتیب سے رکھنے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔ "بظاہر تو یہاں زیادہ جگہ نہیں ہے لیکن..."

"کوئی بات نہیں گولو۔" تانیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں نے ہیرو سے وعدہ کیا ہے۔ میں ابھی یہ سب کچھ ترتیب سے رکھ دوں گی۔ دیکھ لینا... پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے۔"

اور واقعی... اس نے بہت تیزی سے کام کیا۔ اتنے دن گھر سے محروم رہنے کے بعد وہ ان کاموں کو ترس گئی تھی۔ اس وین کی صورت میں ایک گھر اسے میسر آگیا تھا۔ وہ اس کی صفائی میں یوں جتی جیسے برسوں کی تلاش کے بعد کسی کو گھر کے نام پر ایک کھنڈر ملے... اور وہ اسے سچ مچ گھر بنانے پر تُل جائے۔ وہ گنگناتی رہی اور ہر چیز سلیقے سے رکھتی رہی۔ وہ گنگناتی رہی... زندگی کے گیت... اُن گیتوں میں موت کا استرداد تھا... موت سے محبت پر پچھتاوے کا اظہار تھا... اور زندگی جیسے حسین محبوب کے ملنے پر خدا کے حضور تشکر کا اظہار تھا۔

اُس نے تمام کپڑے تہ کیے، اخباروں کو سلیقے سے ایک طرف رکھا، برتن ایک جانب لگائے اور پینٹ کے ڈبے اور پٹرول کا ٹن نشست کے نیچے رکھ دیا۔ اب وہی وین بے حد کشادہ معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں نشستیں صاف کر دی گئی تھیں... اور وہ اپنے مستقبل کے گھر کو دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی تھی۔ اب یہی اس کا گھر تھا، جس [illegible] ہیرو، چالباز، چھپا، رستم، [illegible] اتمیزن اور پروفیسر [illegible] کے ساتھ رہنا تھا۔

وہ اس قدر خوش تھی کہ اسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہاں ان کٹھ پتلیوں کے علاوہ گولو بھی ہوگا... اور وہ شخص بھی جو پس پردہ رہ کر ڈوریاں ہلاتا ہے... جس کے اشارے پر تمام کٹھ پتلیاں ناچتی ہیں... اس کے سات دوست جس کی زبان بولتے ہیں۔

صفائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ وین سے اُتر آئی اب اسے گولو کی تلاش تھی۔ لیکن جب گولو اسے نظر آیا تو وہ اسے پکار بھی نہ سکی۔ اس سے بولا بھی نہ گیا۔ وہ منظر اس کے لیے اتنا ہی عجیب تھا۔ کٹھ پتلیوں کا اسٹال ہیبو کے بل گرا ہوا تھا۔ گولو نے تمام پردے اتار لیے تھے اور اب انھیں تہ کر رہا تھا۔ اسے کوئی کٹھ پتلی نظر نہ آئی۔ قریب ہی صندوق رکھا ہوا تھا۔ شاید تمام کٹھ پتلیاں اس صندوق میں بھر دی گئی تھیں۔ وہ بانس اب بھی گڑا ہوا تھا، جس پر پیٹرومکس لٹکا ہوا تھا۔ اس بانس سے ٹیک لگائے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ وہ نیلی قمیص، نیلی جینز اور کینوس کے سفید جوتوں میں ملبوس تھا۔ سر پر نیلے ہی رنگ کی کیپ تھی... اور ہونٹوں کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ جھول رہا تھا۔

لرزتی ہوئی روشنی اور تھرکتے ہوئے سایوں کی وجہ سے وہ اس کی عمر کا تعین نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے کا انداز اور چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ ہر چیز کا مضحکہ اڑانے والا بے حد سرد مہر آدمی ہے۔ اس کی نظریں تانیا پر جمی ہوئی تھیں... اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

تانیا کے دل کو جیسے کسی سرد سی لہر نے چھو لیا۔ اس شخص کے انداز میں گرم جوشی تھی اور نہ ہی وہ کوئی مہربان آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی جینز کی جیبوں میں تھے۔ تانیا کی معصومیت بھی یہ جانے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ شخص بے حد خود غرض، بے مہر اور سفاک ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس احساس کے باوجود وہ اسے پسند کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ شخص کٹھ پتلیوں کا آقا ہے... اُن کٹھ پتلیوں کا، جنھوں نے اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا تھا... اور اسے زندگی کی طرف کھینچ لائی تھیں... جنھوں نے اسے موت کی حقیقی دہشت اور زندگی کے اصل مفہوم سے روشناس کرایا تھا۔ وہ اُن کٹھ پتلیوں سے محبت کرنے لگی تھی... لیکن ان کے آقا کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے خواہش کی کہ کاش! وہ کٹھ پتلیوں کا آقا نہ ہو... بلکہ کوئی اور ہو... کوئی مزدور، کوئی تماشائی... نجومی...

گولو نے پردے تہ کر کے صندوق میں رکھے اور سیدھا ہو گیا۔ اُس نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ آقا خاموش تھا... اور لڑکی خوف زدہ تھی۔ وہ دونوں یوں اجنبی بنے ہوئے تھے، جیسے ایک دوسرے سے واقف ہی نہ ہوں... جیسے آقا نے پردوں کے پیچھے سے اس لڑکی کو خودکشی کے ارادے سے بڑھتے ہوئے دیکھا ہی نہ ہو... جیسے لڑکی یہ جانتی ہی نہ ہو کہ یہ وہ شخص ہے، جو بے جان کٹھ پتلیوں کو حرکت اور لہجہ دیتا ہے... ان کی زبان ہے... اور پتلیاں اس کے اشارے پر ناچتی ہیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے انجان بن رہے تھے۔ دونوں کے پیش نظر اپنی اپنی وجوہات تھیں... اسباب تھے۔ سہمی ہوئی لڑکی یہ جاننا نہیں چاہتی تھی کہ اتنی مہربان پتلیوں کا آقا اس قدر نامہربان بھی ہو سکتا ہے۔ آقا... سخت دل آقا لڑکی کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ درحقیقت اس نے اس کی جان بچائی ہے۔ چنانچہ گولو کو ان دونوں کا تعارف کرانا پڑا۔

"تانی بے بی، یہ ہیں ہمارے آقا مفلس خان۔ ان کا نام آذر ہے۔" اس نے کہا اور آقا کی طرف دیکھا جو ساکت و صامت کھڑا تھا۔ پھر وہ آقا سے مخاطب [illegible]

پھاند جیسے میں روتی ہوئی، خودکشی کی غرض سے سمندر کی طرف جا رہی تھیں کہ ہیرو نے انھیں دیکھ لیا۔ ہیرو نے انھیں روکا اور ان سے بات کی۔ پھر چالباز نے یہ پتا چلایا کہ یہ اچھا گا سکتی ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر نے انھیں سمجھایا کہ یہ ہمارے ہی ساتھ رہیں۔ بُوا تمیزن نے انھیں بھڑکانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ہیرو نے ان کی شو میں شامل ہونے کی درخواست قبول کر لی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے مبارک ثابت ہوئی ہیں.... اور آئندہ بھی ہوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود اسے یقین تھا کہ تمام پتلیاں آقا کے دست تصرف میں ہونے کے باوجود اپنے افعال و گفتار میں آزاد اور خود مختار ہیں۔ وہ یہ سب کچھ یوں بیان کر رہا تھا جیسے آقا ہر بات سے بے خبر ہو۔ اس وقت وہ پتلیوں کا ترجمان تھا۔

تانیا کا تاثر بھی کم و بیش یہی تھا کہ پتلیاں آزاد ہیں۔ وہ انھیں فرد کی حیثیت دیتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص سے خوف زدہ تھی، جو پہلی نظر میں اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ ملے جلے جذبات لیے کھڑی متوقع نگاہوں سے آقا کو تکتی رہی۔ انداز ایسا تھا، جیسے کسی بھی لمحے بھاگ کھڑی ہوگی۔

آقا نے نظریں گھما کر گولو کو دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ "تو تمھارے خیال میں اس موقع پر مجھے اظہار مسرت کے لیے رقص کرنا چاہیے۔ تم وہی کچھ کرو، جو ہیرو نے کہا ہے، سمجھے؟"

"جی ہاں آقا!" گولو سہم گیا۔ "مجھے سامان گاڑی میں رکھنا ہے؟"

"بس تو پھر کام کرو۔ اور ہاں گاڑی تم چلاؤ گے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" گولو نے کہا اور صندوق اٹھا لیا۔ صندوق خاصا بھاری تھا۔ شاید اسی لیے گولو کی رفتار سست تھی۔ "جلدی کرو مردود۔" آقا نے کہا اور گولو کی کمر پر لات رسید کردی۔ "ابھی تمھیں اسٹال بھی گاڑی کی چھت پر باندھنا ہے۔ اس رفتار سے تو تم صبح کردو گے۔"

گولو نے اس لات پر کوئی احتجاج نہ کیا.... لیکن تانیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے اس انسانیت سوز سلوک کی توقع نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آقا کی نظر میں گولو انسان نہیں، بلکہ کٹھ پتلی ہے لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی.... جب کہ گولو بھی اس توہین کو پی گیا تھا۔

آقا تانیا کی طرف مڑا اور اس نے پہلی بار تانیا سے خطاب کیا۔ گفتگو کے دوران بھی سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لٹک رہا تھا.... اور ایک بار بھی لرزتا دکھائی نہ دیا تھا.... بلکہ تانیا نے تو اس کے ہونٹوں کو بھی جنبش کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ اس میں آدمی ہونٹ ہلائے بغیر بھی بول سکتا ہے۔

"ہاں.... تو تم تانیا ہو۔ یہاں آؤ میرے قریب۔"

تانیا کسی سحر زدہ معمول کی طرح بلا ارادہ اس کی طرف کھنچی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے روبرو تھی اور وہ کسی قصائی کے سے انداز میں اس کا سر تا پا جائزہ لے رہا تھا، جیسے وہ لڑکی نہیں، بلکہ قربانی کا جانور ہو۔

"گولو سے ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے جیسے تانیا کے خیالات پڑھ لیے تھے۔ "اس سے اچھی زندگی اسے کہیں نہیں مل سکتی۔ اور اب تم میری بات ذرا غور سے سنو...." اس نے توقف کیا اور سگریٹ کو ہونٹوں کے درمیان حرکت دی۔

تانیا کا جسم لرز رہا تھا۔

"اگر تم ڈھنگ سے رہیں تو عمر بھر ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔" اس نے بات پوری کی۔ "لیکن تمھیں ایکٹ کے سلسلے میں بھی کام کرنا ہوگا۔ نہیں کرو گی تو تمھیں لات مار کر نکال باہر کروں گا۔ ہیرو خواہ کچھ بھی کہے۔ ہیرو تمھیں پسند کرتا ہے۔ چالباز اور راگی کا خیال ہے کہ تم گا سکتی ہو۔ مجھے تمھارا بچکانہ چہرہ سخت ناپسند ہے۔ بہرحال.... اگر آمدنی بڑھتی ہے تو اس کی خاطر میں تمھیں برداشت کرسکتا ہوں۔ بس اب گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھ جاؤ۔ اگر بھوک لگے تو [illegible] ہو کھا لینا.... بولنا مت.... اب چل دو۔"

www.BooksPK.com

اگر اس وقت تانیا کے پاس اس کی باسکٹ موجود ہوتی تو وہ یقیناً پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ لیکن اس کی باسکٹ وین میں تھی۔ یہ بات نہیں کہ باسکٹ میں کوئی قیمتی چیز تھی لیکن وہ اس نسوانی جبلت کو کیا کرتی، جس کے تحت عورت کے لیے اپنی حقیر ترین چیز سے دست بردار ہونا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی تھا، وہ کہاں جاتی؟ اب خود کو سمندر کے سپرد کرنا تو ناممکن تھا کیوں کہ وہ خونخوار مچھلیوں کے بارے میں سن چکی تھی۔

آنسوؤں نے اس کی بصارت دھندلا دی تھی۔ تاہم وہ خاموشی سے پلٹی اور وین کی طرف بڑھ گئی۔ وین میں بیٹھ کر وہ آوازیں سنتی رہی، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ گولو اسٹال کو گاڑی کی چھت پر رکھ کر باندھ رہا ہے۔

آقا وین کی درمیانی نشست پر جا لیٹا۔ اس نے جوتے اتار دیے تھے اور کیپ سر پر کھینچ لی تھی۔ گولو نے وین اسٹارٹ کی.... پھر وہ ساحل سے دور ہوتی گئی۔ تانیا عقبی حصے میں نشست پر سہمی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو خشک کیے اور چٹنی سے لگا لگا کر روٹی کھانے لگی۔ آقا کی شخصیت اور اس کے رویے کے باوجود یہ امر اس کے لیے طمانیت خیز تھا کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے محفوظ تھی.... اس کے پاس سر چھپانے کو ٹھکانا بھی تھا اور محبت کرنے والے سات دوست بھی۔

کھانے کے بعد وہ نشست پر دراز ہوگئی۔ وہ دیر تک اپنے نئے دوستوں کے بارے میں سوچتی رہی.... اور مسکراتی رہی۔ ہیرو.... اس کا منیجر.... اس کی پریشانیاں.... چالباز، جو عیار ہونے کے باوجود محبت کے قابل تھا.... رستم، جو دوسروں کو ڈرانے کی ناکام کوششیں کرتا تھا.... چمپا، جو مغرور اور سر پھری تھی.... راگی، جس کی آواز بے حد نرم اور شیریں تھی اور انداز دوستانہ تھا.... افواہ ساز بُوا تمیزن، جو جہاندیدہ تھی اور دوسروں کے لیے خوف زدہ رہتی تھی، انھیں مشورے دیتی تھی.... پروفیسر عقل مند جو بے حد ہمدرد تھا.... کھوٹے بناتا تھا.... جوڑتا تھا، جس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ وہ ان سب کے بارے میں سوچتی رہی.... مسکراتی رہی.... یہاں تک کہ اسے نیند آگئی....

★★

کٹھ پتلیوں کے آقا کا، جو خود کو مفلس خان کہتا تھا، اصل نام آذر تھا۔ وہ شہر کے تنگ و تاریک گلی کوچوں کی پیداوار تھا۔ اس کی پرورش [illegible] میں ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں نرم دلی، رحم اور محبت کا کوئی خانہ نہیں تھا، کیوں کہ اس نے زندگی کا صرف ایک ہی روپ دیکھا تھا.... سختی کا روپ.... جس میں بقا کے لیے سخت جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لیے زندگی بازار کی اس بھیڑ کی مانند تھی، جس میں ہر شخص کو آگے بڑھنا ہے جہاں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ایسے میں کوئی کمزور شخص گر جائے تو اسے اٹھانے والا کچل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں بقا کی ایک ہی صورت ہوتی ہے.... اور وہ یہ کہ گرنے والے کے وجود پر پاؤں رکھ کر آگے نکل لیا جائے۔ اس بھیڑ میں رحم دلی کا مظاہرہ کرنے والے کو صرف موت ملتی ہے۔ آذر نے بچپن ہی میں یہ سب کچھ سیکھ لیا تھا۔

باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ چنانچہ اسے کبھی یہ علم نہ ہوسکا کہ باپ کی شفقت اور سائے کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی ماں سڑکوں پر محنت مزدوری کرتی تھی۔ چنانچہ آذر کو ابتدائی عمر ہی میں یہ احساس بھی ہوگیا کہ محنت مزدوری وہ کرتا ہے جو غریب ہوتا ہے.... اور غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اپنی ماں کے حوالے سے اسے ان باتوں کا علم وقت سے بہت پہلے ہوگیا، جو صرف بلوغت سے مشروط ہوتی ہیں۔ اس کی عمر چھ سال تھی کہ اس کی ماں کو کسی سڑک چھاپ غنڈے نے قتل کر دیا۔ آذر کو اپنی ماں کا جرم معلوم تھا۔ وہ غربت کے باوجود عزت دار بننے کی کوشش کرتی تھی بالآخر وہ اسی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ آذر کا احساس تھا کہ اس کی ماں طبعاً معصوم تھی۔ اور اس کے نزدیک معصومیت کو اس دنیا میں صرف ایک انعام مل سکتا تھا.... موت! یہی وجہ ہے کہ اسے معصومیت سے نفرت ہوگئی۔

ماں کی موت کے بعد سرکس میں کام کرنے والے ایک لاولد جوڑے نے آذر کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ آذر کا منہ بولا باپ سرکس میں آگ کھانے کا کرتب دکھاتا تھا۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔ اسے یہ علم بھی نہیں تھا کہ اسے ایک بیٹا مل گیا ہے۔ منہ بولی ماں رقاصہ تھی.... اور آذر پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ آذر کی ہر خواہش.... ہر فرمائش پوری کرتی۔ لیکن آذر کو اس سے نفرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اپنی ماں نہایت بے وقوف عورت تھی.... لیکن منہ بولی ماں کو دیکھ کر اصل ماں کی بے وقوفی کا احساس بے حد شدید ہوجاتا۔ ان دونوں ماؤں میں بڑا سفاکانہ تضاد تھا۔ ایک عزت دار بننے کی کوشش میں غیر فطری موت سے ہم کنار ہوئی تھی.... دوسری بے غیرتی کے سائے میں پھل پھول رہی تھی۔ سرکس سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ تو شرابی شوہر کی نذر ہوجاتی تھی چنانچہ منہ بولی ماں تماشائیوں کے ساتھ اکثر باہر جاتی رہتی تھی۔ یوں سرکس کی تنخواہ حقیر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس عورت نے بہت پہلے سمجھوتے کا مفہوم سمجھ لیا تھا.... جان لیا تھا کہ دنیا کمزوروں سے جو کچھ طلب کرتی ہے لے کر رہتی ہے۔ ہنسی خوشی دے دو تو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مزاحمت کرو تو کچھ بھی نہیں ملتا.... اور جانے والی چیز بہرحال جا کر رہتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ چار دیواری سے محروم عورت آبرو سے نہیں جی سکتی۔ چنانچہ اس نے سمجھوتا کر لیا تھا.... اور خوش تھی۔ فطرت کے اعتبار سے وہ محبت کرنے والی عورت تھی۔ اولاد کی کمی اس نے آذر کی صورت میں پوری کرلی تھی۔ وہ آذر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی.... بے غرض محبت۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

آذر کا منہ بولا باپ دنیا سے رخصت ہوا تو آذر کی عمر بارہ سال تھی۔ اس روز منہ بولا باپ کرتب دکھانے کے لیے آیا تو نشے میں دھت تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے اپنے منہ میں کتنا پٹرول بھر لیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منہ سے شعلے اگلنے کے بجائے شعلے نگلنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی موت بے حد کربناک، اور دیکھنے والوں کے لیے بے حد خوف ناک تھی۔ وہ اندر سے جل گیا تھا۔ آذر وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ صرف بارہ سال کی عمر میں اس نے

موت کا اس قدر خوف ناک روپ دیکھا تھا کہ اس کے نزدیک زندگی کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ صرف اپنی زندگی کی۔ اس نے جان لیا کہ زندگی اہم ترین چیز ہے... اور سب کچھ قربان کر کے صرف جیا جا سکتا ہے۔ نہیں بلکہ ارزاں ترین سودا ہے۔ زندگی کے مقابلے میں ہر چیز حقیر ہو کر رہ گئی۔

پھر آذر کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی بن مانگی ماں کو بدلتے دیکھا۔ وہ عورت جو صرف چند نوٹوں کے لیے دانستہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی تھی، شوہر کی موت کے بعد گویا بکھر کر رہ گئی۔ اس نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا۔ مرد اور عورت کے تعلق کا یہ انوکھا روپ آذر کی سمجھ سے باہر تھا۔ ۲۲ برس بعد اب بھی وہ تعلق اس کے لیے ایک معما تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی کسی کے لیے کیسے مر سکتا ہے۔ لیکن اس نے ایک سال کے عرصے میں اپنی بن مانگی ماں کو نفس نفس مرتے دیکھا۔ وہ قسط وار موت بھی بے حد خوف ناک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس عورت کو اندر ہی اندر کوئی گھن چاٹ رہا ہو۔ بالآخر ایک سال بعد وہ بھی مر گئی، اور آذر ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۲ سال تھی۔

اب وہ تھا اور شہر کی اندھیری گلیاں۔ ایک کمزور لڑکے کی حیثیت سے جینا بہت مشکل تھا۔ لیکن وہ اندھیری گلیاں اس کی تربیت گاہ بن گئیں۔ وہ لڑنے بھڑنے، چاقو چلانے، فرار ہونے میں طاق ہو گیا یعنی اس نے جان لیا کہ بدترین حالات میں بھی کیسے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ وہ گھر کے مفہوم سے ناآشنا تھا۔ کچھ طبیعت میں بھی آوارگی تھی۔ وہ کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرا۔ بس ادھر اُدھر گھومتا رہا... زندگی کو بس گزارتا رہا۔ اب اس کی عمر ۳۰ سال تھی۔

نسوانی نکتۂ نظر سے وہ ایک خوبرو مرد تھا۔ گٹھا ہوا بدن، لمبا قد، بھورے بال، بھوری سرد آنکھیں، بیٹھی ہوئی ناک جو ایک تفنگچے سے ہونے والی لڑائی کی یادگار تھی... اور چہرے پر زندگی کے موسموں کی چھوڑی ہوئی سختی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ نفرت اور تلخی کی تحریر ہوتی تھی۔

زندگی میں کسی نے اس پر کبھی کوئی مہربانی نہیں کی تھی... سوائے بن مانگی ماں کے... اور اس سے وہ نفرت کرتا تھا۔ شاید اسی لیے اسے مہربانی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اس کا کہنا تھا کہ اسے جو کچھ دنیا نے دیا ہے، وہ دنیا کو وہی کچھ لوٹائے گا۔ اچھائی، نیکی اور انسانی فطرت کے بھلے پہلو جیسی کسی چیز پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ عزت کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک ہر انسان زندگی کے معاملے میں اس کا حریف تھا۔ وہ صرف ان انسانوں سے ربط رکھتا تھا جنہیں استعمال کر سکے۔ اپنی زندگی کے لیے وہ کسی کا گلا بھی گھونٹ سکتا تھا۔ وہ ملکیت کے احساس سے ناآشنا تھا۔ جب تک آدمی کا کوئی گھر نہ ہو، ملکیت کا احساس تعلیم ہوتا بھی نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی چیز اس کی اپنی نہیں تھی... سوائے خود اپنے۔ اور یہی چیز سب سے اہم تھی۔ عورت ہو، بچہ ہو یا خدا ہو، اس کی نگاہوں میں نہ کسی کی اہمیت تھی، نہ عزت۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی... اور محبت کے بغیر آدمی احترام کرنا نہیں سیکھ سکتا۔ عورتوں کو وہ اتنی ہی اہمیت دیتا تھا، جتنی روٹی کو۔ بھوک لگے تو روٹی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے۔ لیکن پیٹ بھرنے کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ فاقوں سے نہیں ڈرتا تھا... اور پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے بعد روٹی کو بے پروائی سے ایک طرف پھینک دیتا تھا۔

اگر کوئی اس سے پوچھتا اس نے سوکھی سڑی چیرخ تانیا کو مرنے سے کیوں بچایا ہے تو وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اصرار کرتا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نہ تو اس نے خودکشی کی نیت سے ساحل کی طرف بڑھنے والی لڑکی کو روکا تھا... اور نہ ہی اسے اپنے اہلِ خانہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس کے نزدیک وہ سب کچھ اس کی کٹھ پتلیوں کا کیا دھرا تھا۔ ان میں ہیرو، جالباز اور پروفیسر عشق سند جیسی ہوشیار تھے۔ آخری فیصلہ بہرحال ہیرو کا تھا۔

بے شک... پردے کے پیچھے بیٹھ کر ڈوریاں وہی ہلاتا تھا... وہ ان تتلیوں کو آواز دیتا تھا... لیکن اس کے نزدیک وہ ساتوں کٹھ پتلیاں آزاد روح رکھتی تھیں۔ وہ ساری آزاد تھیں۔ ان کی سوچ اور فکر ان کی اپنی تھی۔ وہ تو محض ان کی ترجمانی کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ان تتلیوں پر اس کا کوئی زور نہیں ہے۔ وہ اپنے قول و فعل میں آزاد ہیں۔ اس نے اس سلسلے میں کبھی زیادہ سوچا بھی نہیں تھا۔ بس اسے اس بات پر یقین تھا کہ وہ تمام پتلیاں اپنی مرضی کی مالک ہیں اور انسان کے معاملات میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ یقین اس کے لیے بے حد طمانیت بخش تھا۔

پتلیوں کی تخلیق کا سلسلہ بھی عجیب تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہ وہیں تھا... اور جنگی قیدی بنا کر قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے سرکس کے ماحول میں ایک عمر گزاری تھی اور اسے بے شمار کرتب آتے تھے لیکن کیمپ میں قید کی زندگی کے دوران اس میں تخلیق کی خواہش پوری شدت سے ابھر آئی۔ وہ کیمپ اس اعتبار سے اس کے لیے ایک درس گاہ ثابت ہوا کہ وہاں اسے فطرتِ انسان کے مطالعے کا موقع ملا۔ وہ اظہار کا بھی کبھی قائل نہیں رہا تھا... بلکہ اظہارِ ذات کا تو وہ مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا لیکن کیمپ کی خشک زندگی میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پر مجبور ہو

گیا اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا۔ وہ ایک فرد تھا۔۔۔ ایک اکائی۔۔۔ لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنے آپ کو منوا نہیں سکا تھا۔۔۔ اپنا اثبات، وجود دوسروں پر ثابت نہیں کر سکا تھا۔ یہی محرومی انسان کو اظہارِ ذات کی ترغیب دیتی ہے لیکن وہ اظہار کو گھٹیا پن سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کے شعور نے اظہارِ ذات کی خواہش کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ یوں وہ خواہش اس کے لاشعور میں محصور ہو گئی۔ یہ شعور اور لاشعور کے درمیان ہونے والی اس جنگ کا نقطۂ آغاز تھا، جو انسان کے وجود میں ازل سے ہوتی آ رہی ہے۔ شعور سادہ لوح ہوتا ہے اور ہر شے کو اس کے اصل روپ اور مفہوم میں سمجھتا، قبول کرتا اور یاد رکھتا ہے۔ اس کے برعکس لاشعور ایک عیار بہروپیا ہے، جو چیزوں کی ہیئت اور مفہوم بدل کر انھیں شعور کے لیے قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

یہاں بھی یہی ہوا۔ آذر کے لاشعور نے شعور کی مزاحمت کا اندازہ کر لیا تھا، چنانچہ اس نے چھپ کر وار کیا۔۔۔ اظہارِ ذات کی خواہش کو خود کو منوانے کی خواہش کے میک اپ میں شعور کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک دن آذر کیمپ کمانڈر کے سامنے پیش ہوا اور اسے بتایا کہ وہ تفریح کو ترسے ہوئے قیدیوں کے لیے تفریح کا سامان کرنا چاہتا ہے۔ کیمپ کمانڈر نے اس کی بات بڑی توجہ سے سنی۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے اور قیدیوں سے بری طرح عاجز تھا۔ سخت پہرے کے باوجود وہ لوگ آئے دن فرار ہونے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ وہ ان کی جی داری سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید تفریح کی وجہ سے قیدیوں کی شرارتوں میں کچھ کمی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے آذر کی تجویز مان لی اور اسے سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے روز آذر نے کام شروع کر دیا۔ اس نے پہلا پتلا تخلیق کیا۔ پھر اس پر رنگ و روغن کیا۔ یوں بھورے بالوں، بھوری آنکھوں والا ہیرو سامنے آیا۔ اس کے بعد اس نے چھ مزید کٹھ پتلیاں تخلیق کیں۔ آواز پر تو اسے پہلے ہی بے پناہ قابو تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے قیدی ساتھیوں کے لیے کٹھ پتلیوں کے تماشے کا اہتمام کیا۔ کیمپ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھی بے حد خوش تھے۔

اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ ساتوں پتلیاں اس کی ہفت رنگ اور متنوع فطرت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ اظہارِ ذات کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اسے بس اتنا پتا چلا کہ اس کی تخلیق کردہ پتلیاں خود مختار ہو گئی ہیں۔ ڈوری اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اس کی انگلیاں ان کی مرضی کے مطابق حرکت کرتی ہیں۔ آواز اس کی ہوتی ہے۔۔۔ لیکن سوچیں اور ان پتلیوں کی ہوتی ہیں۔۔۔ اور لفظ جیسے آسمان سے اترتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا تھا۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے اسے اکثر احساس ہوتا کہ وہ نہیں ہے بلکہ وہ ساتوں ہیں۔ تماشے کے دوران اس کا اپنا وجود معدوم ہو کر رہ جاتا تھا۔

گوگو بھی اسے کیمپ ہی میں ملا تھا۔ گوگو کو پتلی تماشے نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ گوگو کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔۔۔ نہ قیدی، نہ پہرے دار۔ بعض اوقات اسے بھوکا ہی سونا پڑتا تھا۔ آذر کو پتلی تماشے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ اس نے کمانڈر سے اجازت لے کر گوگو کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس دن سے گوگو اس کے ساتھ تھا۔ آذر کے لیے اس کی حیثیت ایک کاما سدرشن کی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گوگو کا اس کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور وہ اسے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔ اسی لیے وہ اکثر اس کے ساتھ زیادتی کر گزرتا تھا۔ جب بھی اس کا موڈ خراب ہوتا، نزلہ گوگو ہی پر گرتا۔۔۔ اور گوگو نے کبھی اف بھی نہیں کی تھی۔ اس اعتبار سے آذر اپنی چھوٹی سی دنیا کا بادشاہ تھا۔۔۔ آقا۔

آذر کے لیے یہ تماشا ایک طرح کا جادو تھا۔ اس کی روح کسی نامعلوم پروسس کے تحت اس کے جسم سے نکل کر کٹھ پتلیوں میں حلول کر جاتی تھی لیکن وہ حلول کے فلسفۂ تخلیق سے مطلق بے خبر تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کوئی انسان ہو، دنیا سے پوری طرح کٹ کر [illegible] کا ہیولا بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔۔۔ [illegible] میں چھپی ہوئی، دبی ہوئی [illegible] سی کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔ تاہم وہ بعض اوقات کٹھ پتلیوں کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا۔ ان کے ردعمل اس کے لیے حیرت خیز ثابت ہوتے۔ وہ انھیں اپنی مخلوق سمجھتا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی اپنی فطرت کے مظاہر ہیں۔۔۔ قیدِ وجود سے وقتی فرار کا ذریعہ ہیں۔ ہیرو، چالباز اور چپیا اگر اس کا ظاہر تھے تو باقی چاروں اس کے باطن کا عکس تھے۔ زاگی اس میں چھپے ہوئے فنکار کی نمائندگی کرتا تھا، جسے موسیقی سے پیار تھا۔ رستم اس روح کی علامت تھا جو دوستی اور پیار کو ترستی تھی، جسے زندگی کی سختیوں نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ لو آمیزن اس کی فطرت کے اس پہلو کی عکاسی کرتی تھی، جس کے تحت وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اس کی جہاندیدہ آنکھوں نے دنیا کو ہمیشہ۔۔۔ ناقابلِ اعتبار دیکھا تھا۔ پروفیسر عقل مند اس کے اندر چھپے ہوئے اس فلسفی کا استعارہ تھا، جس نے تعلیم کی کمی کو مطالعے سے پورا کرنے کی کوشش کی تھی، جو طبعاً ہمدرد تھا لیکن دنیا کی سفاکی کے پیشِ نظر اس نے خود اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

شکر ساحرے کے بعد وہ واپس آیا تو پتلی تماشا اس کی عادت بن چکا تھا۔ دوسری طرف قیدِ مسلسل کی وجہ سے گھومنے پھرنے کی خواہش پوری شدت سے ابھر آئی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ٹیمپو ویگن خریدی، اسٹال بنوایا اور کٹھ پتلیوں کے ذریعے روزی کمانے لگا۔ گوگو جیسا بندۂ بے دام اسے پہلے ہی میسر تھا۔ تماشے کے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ آذر وین کے درمیانی حصے میں موجود نشست پر سوتا تھا جب کہ گوگو کسی بھی فٹ پاتھ پر یا پارک میں پڑا رہتا تھا۔ وین کا عقبی حصہ خالی ہونے کے باوجود آذر نے گوگو کو کبھی وین میں سونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ گوگو کو اس کی خواہش بھی نہیں تھی۔

گزشتہ رات جہاندیدہ اور تجربے کار آذر نے تانیا کو ساحل کی طرف بڑھتے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ وہ خودکشی کی غرض سے نکلی ہے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ میں موجود باسکٹ اور اس کے ڈھلکے ہوئے کندھوں نے پوری کہانی سنا دی تھی۔ لیکن آذر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ موت کوئی غیر معمولی چیز تو ہوتی نہیں کہ اس کی پروا کی جائے۔۔۔ خواہ خودکشی کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو لیکن وہ ہیرو تھا، جس نے مداخلت کر کے لڑکی کی جان بچائی تھی۔ ورنہ آذر کو کسی معصوم اور بے سہارا لڑکی کے جینے مرنے سے غرض نہیں تھی۔ محض دلچسپی اور تجسس کی وجہ سے اس نے کٹھ پتلیوں کے کام میں مداخلت کی کوشش بھی نہیں کی۔ یوں اس کے گھرانے میں ایک [illegible] اضافہ ہوا۔

[illegible] تماشا پر کٹھ پتلیوں کا جادو چلتے دیکھ کر لڑکی مسحور ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔ خود کو بھی بھول گئی تھی۔ اس لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔ وہ اعتبار کرنا جانتی تھی۔ وہ کٹھ پتلیوں سے یوں باتیں کر رہی تھی، جیسے ان کے وجود پر یقین رکھتی ہو۔ آذر کی تجربہ کار نگاہوں نے اس لڑکی کی اہمیت بھانپ لی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی۔۔۔ کچھ بھی تھی، تماشے اور تماشائی کے درمیان ایک پل کا کام کر سکتی تھی۔ وہ ایک ایسا رابطہ ثابت ہو سکتی تھی جو تماشے اور تماشائی کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس کی کٹھ پتلیوں سے گفتگو اتنی بے ساختہ اور فطری تھی کہ اس نے تماشائیوں کے دل چھو لیے تھے حالاں کہ تماشائیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف اس کا یقین تھا کہ وہ کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ گزشتہ رات وہ تماشائیوں کے تاثرات بھی بغور دیکھتا رہا تھا۔ معمولی سی تربیت کے بعد وہ مفلس خان اور اہلِ خانہ کے لیے ایک اچھا اثاثہ ثابت ہوتی۔ وہ اسٹیج کے قریب کھڑی ہو کر پتلیوں اور تماشائیوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی۔ اس طرح آمدنی میں یقینی اضافے کا امکان تھا۔ آمدنی کی اہمیت اس لیے [illegible] کہیں زیادہ ان کی وین کے اخراجات تھے۔ آذر نے سوچا کہ لڑکی بوجھ ثابت ہونے لگی تو اسے کسی بھی وقت لات مار کر نکالا جا سکتا ہے۔

لیکن تانیا میں ایک خصوصیت اور تھی، جو آذر کے لیے بہت زیادہ پرکشش ثابت ہوئی تھی۔ اس خصوصیت کو دیکھ کر اسے لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔۔۔ اس کے اپنے وجود میں نفرت کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نفرت اس کے لیے بے حد آسان تھی۔ وہ خصوصیت تھی تانیا کی معصومیت اور اس کا خالص پن۔ آذر معصومیت کا دشمن تھا۔ عورت ہو، بچہ ہو یا مرد۔۔۔ وہ معصومیت کو کسی بھی روپ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ پوری دنیا کو غلاظت اور آلودگی میں ملوث کر کے رکھ دیتا۔ چنانچہ تانیا کی معصومیت اس کے لیے ایک چیلنج تھی۔۔۔ ایسا چیلنج، جسے وہ قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کار کے عقبی حصے میں تانیا بے سدھ ہو کر سوئی۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ جاگی تو صبح ہو چکی تھی۔۔۔ اور وین کے عقبی حصے میں وہ تنہا تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ سرکس میں کسی ساتھی لڑکی کے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے رات کے واقعات یاد آ گئے۔ سارا سکون و اطمینان رخصت ہو گیا اور مایوسی اور ناکامی کا احساس لوٹ آیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ وین کے شیشے سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی باہر دیکھتی رہی۔ بالآخر اس کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ شیشے سے جھانکنے پر اسے جگہ کا تو پتا نہ چل سکا۔۔۔ لیکن اتنا اندازہ۔۔۔ بہرحال ہو گیا کہ گاڑی کسی میلے میں کھڑی ہے۔

وہ گاڑی سے اتر آئی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بے حد وسیع و عریض احاطہ تھا۔ احاطے میں میدان تھا، ایک حصے میں گھاس اگی ہوئی تھی اور پھولوں کے کچھ پودے بھی تھے۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ بدستور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ ایک ایسے اہم مسئلے کے بارے میں سوچ رہی تھی، جس سے اس کا پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کم از کم وہ مسئلہ اس سے پہلے اس کے لیے مسئلہ کبھی نہیں رہا تھا۔ اسے خود پر شرم آنے لگی لیکن اتنے اہم مسئلے کو وہ نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بظاہر کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے آذر کو ایک طرف سے آتے دیکھا۔ آذر نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عام حالات میں تانیا کی خودداری اس تغافل کے بعد اس سے بات کرنے کی

www.BooksPK.com

آذر کی طرف بڑھی۔ اس نے اسے سلام کیا۔ وہ بے رُخی سے جواب دے کر آگے بڑھنے لگا۔
"سنیے...." تانیا نے اسے پکارا۔
اس نے پلٹ کر سخت نگاہوں سے اسے دیکھا "کیا بات ہے؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔
"وہ... میں... دراصل... میں..." وہ ہکلا کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔
"کیا بک رہی ہو؟" آذر جھنجلا گیا۔
"میں... وہ... دیکھیں نا... صبح ہو گئی ہے..." اس بار بھی وہ اپنا مافی الضمیر واضح نہ کر سکی۔
آذر نے اسے بغور دیکھا... اور وحشیانہ انداز میں ہنسنے لگا "اوہ... میں سمجھ گیا" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "تمہارے پاس ٹھکانا کوئی نہیں ہے... اور انداز شہزادیوں کے سے ہیں۔ سنو احمق لڑکی... اس طرزِ زندگی میں لیٹرین جیسی عیاشی ممکن نہیں۔"
توہین کے احساس سے تانیا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی "پھر میں کیا کروں؟"
"صبح جلدی اٹھنے کی عادت ڈالو۔" آذر کا لہجہ اب بھی زہریلا تھا "یہ میدان بہت بڑا ہے..... اور صبح کے وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا۔"
اب تانیا کے لیے آنسو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
آذر چند لمحے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر قدرے نرم لہجے میں بولا "اس شہر میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں، جو بے گھر ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں بھی اُن میں شامل ہوں۔"
تانیا بدستور روتی رہی۔ آذر چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر چلا گیا۔ تانیا روتی رہی۔ پھر ایک مہربان آواز نے اُسے چونکا دیا "کیا بات ہے بی بی؟"
تانیا نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے اور نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ گوگو تھا۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔
"کیا بات ہے بی بی؟" گوگو نے پھر پوچھا۔
"وہ.... وہ بالکل جانور ہے... جنگلی ہے" تانیا نے کہا اور دوبارہ رونے لگی۔
گوگو چند لمحے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر بولا "میں سمجھ گیا۔ آؤ میرے ساتھ۔"
تانیا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ وہ اسے میدان سے باہر لے آیا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر [illegible]

عورت نے دروازہ کھولا "کیا بات ہے گوگو؟" اس نے بے حد پُرتپاک لہجے میں پوچھا۔ شاید وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔
"یہ بی بی بھی اب ہمارے ساتھ کام کرتی ہے تابو۔ تُو اسے اندر لے جا... اور اس سے پوچھ لے۔" گوگو نے کہا اور پھر تانیا سے مخاطب ہوا "میں جا رہا ہوں، تم بعد میں آجانا۔" یہ کہہ کر وہ واپس ہو گیا۔
عورت تانیا کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئی۔ وہ بہت اچھی طبیعت کی تھی لیکن اس کی فطرت میں تجسس بہت زیادہ تھا۔ وہ تانیا سے کرید کرید کر اُس کے بارے میں پوچھتی رہی... وہ کون ہے... پُتلی تماشے والے کے ہتھے کیسے چڑھ گئی... تانیا کو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ وہ گول مول جواب دیتی رہی... تاہم اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔
"اس پُتلی والے سے ہوشیار رہنا۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے... اور تم مجھے بہت معصوم لگتی ہو۔" عورت نے اسے سمجھایا۔ تانیا کو یہ بات بھی بُری لگی تاہم اس نے عورت کا شکریہ ادا کیا.... اور باہر آگئی۔ وہ احاطے میں داخل ہوئی.... اور مالی کی طرف بڑھ گئی۔ مالی نے ایک نظر اُسے دیکھا... اور خاموشی سے پائپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ تانیا نے کلی کر کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ پہلی بار اُسے طمانیت کا احساس ہوا۔ وہاں سے وہ وین کی طرف بڑھی۔ پُتلی تماشے کا اسٹال وین کی چھت سے [illegible] ایک طرف کھڑا کر دیا گیا تھا... لیکن تانیا کو وہاں نہ آذر نظر آیا، نہ گوگو دکھائی دیا۔ وہ وین کی طرف بڑھ رہی تھی کہ عقب سے جانی پہچانی آواز سنائی دی "صبح بخیر تانیا کیسی ہو؟"
اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسٹال کے اسٹیج پر چالباز موجود تھا۔ چالباز نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر لوفرانہ انداز میں سیٹی بجائی اور بولا "ہیلو بے بی! منہ دھو کر آئی ہو؟"
"ہاں، میں نے تو منہ دھو لیا ہے۔ تم اپنی سناؤ۔" تانیا نے اُس پر چوٹ کی۔ اُسے دیکھتے ہی اس کے مزاج کی شگفتگی بیدار ہو گئی تھی۔
"نہیں، میں نے منہ نہیں دھویا ہے لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔" چالباز نے جلدی سے کہا "اور دیکھ لینا، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میرا منہ ہی ایسا ہے۔" اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے غوطہ لگایا اور چند لمحوں کے لیے غائب ہو گیا۔ وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں پانچ کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے نوٹ تانیا کی طرف بڑھایا "یہ ناشتے کے لیے ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر غوطہ لگا گیا۔
[illegible]

کہا "نیند تو ٹھیک آئی تھی؟"
"ہاں ہیرو۔ میں خوب سوئی۔" تانیا نے جواب دیا۔ طمانیت کا احساس اور گہرا ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر دوستوں کے درمیان تھی۔ ان کے پاس کھڑے ہونا..... ان سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگتا تھا۔
"اچھا... اب تم جا کر ناشتا کرو۔ احاطے کے باہر حلوہ پوری کا ٹھیلا موجود ہے۔ قریب ہی چائے والا بھی ہے۔ جلدی کرو، مجھے شو کی تیاری کے سلسلے میں بہت کام کرنا ہے اور ہاں... جو پیسے بچیں وہ ایمان داری سے واپس لا دینا۔"
"تم فکر نہ کرو ہیرو۔" تانیا نے کہا اور جانے کے لیے مڑی۔
"شش... بشش۔" عقب سے کسی نے پکارا۔ تانیا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چالباز تھا اور اشارے سے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ تانیا اس کے قریب چلی گئی۔ چالباز نے اسے کان قریب لانے کا اشارہ کیا۔ تانیا اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گئی تو اس نے سرگوشی میں کہا "پیسے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"
چالباز کے ہونٹوں پر ایک عیار مسکراہٹ لرزی اور آنکھیں چمکنے لگیں "شش... اتنے زور سے مت بولو۔" اس نے پھر سرگوشی کی "بات یہ ہے کہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ ناشتے میں پورے پیسے خرچ ہو گئے.... اس طرح پیسے واپس کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔"
"لیکن چالباز، میں اتنی چیٹر تو نہیں ہوں۔" تانیا نے احتجاج کیا۔
"میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تم پورے پانچ روپے کھا جاؤ۔ میں تو تمہیں پیسے بچانے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔ بس ایمانداری سے آدھے پیسے مجھے دے دینا۔ اسکیم تو میری ہی ہے نا۔"
تانیا نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر تھا "نہیں چالباز.... میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں بددیانت نہیں ہوں۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔
چالباز نے مضحکہ خیز انداز میں قہقہہ لگایا "یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہی ایک صورت ہے آقا سے پیسے نکلوانے کی۔ میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں۔ یوں تم عمر بھر کام کرو گی تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"
"جیسی بھی... چالباز، مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔" تانیا نے کہا اور پلٹ گئی۔
وہ ناشتا کر کے واپس آئی تو اسٹیج پر ہیرو اور چمپا موجود تھے۔

کوشش کر رہی تھی۔ لیکن سر اور کنگھے والے ہاتھ کے تاروں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے دشواری ہو رہی تھی۔ پھر ہیرو نے کنگھا سنبھالا... لیکن بات اب بھی بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ لوگ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔
اچانک ہیرو کی نظر تانیا پر پڑی "اوہ... تم واپس آگئیں؟ ناشتا کر لیا تم نے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں ہیرو، شکریہ۔ اور یہ پیسے بچے ہیں۔" یہ کہہ کر تانیا نے بچے ہوئے تین روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔
ہیرو نے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اثبات میں سر ہلایا اور روپے لے لیے "بہت سستا ناشتا کیا ہے تم نے۔" اس نے تبصرہ کیا اور روپوں سمیت غوطہ لگا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ دوبارہ اُبھر آیا اور بولا "میں کب سے چمپا کے بالوں میں کنگھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے سر میں جوئیں بھی بہت ہو گئی ہیں۔"
"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" چمپا نے پُرزور احتجاج کیا "میرے سر میں جوئیں کیسے ہو سکتی ہیں؟"
"ممکن ہے، میں غلط کہہ رہا ہوں۔" ہیرو نے بڑی سادگی سے اعتراف کیا "ہو سکتا ہے، میں بھینسوں کو جوئیں سمجھ بیٹھا ہوں۔"
"یہ ہمیشہ یوں ہی بکواس کرتا ہے۔ میں اسے لفٹ جو نہیں دیتی۔"
"اس کے باوجود میں تمہاری زلفیں سنوارنے میں لگا ہوا ہوں۔"
"خاک زلفیں سنوار رہے ہو۔ میرا سر دکھا کر رکھ دیا تم نے۔" چمپا روہانسی ہو گئی۔
"اب میں کیا کروں، تمہارے بال ہی ایسے ہیں، جیسے ابابیل کا گھونسلا۔" ہیرو نے ترکی بہ ترکی کہا۔
"اچھا.... اب تم لوگ لڑو مت۔" تانیا نے انھیں سمجھایا پھر وہ ہیرو سے مخاطب ہو گئی "یہ کام مردوں کے بس کا نہیں ہوتا۔ لاؤ کنگھا... میں چمپا کے بال سنواروں گی۔"
"یہ غلط ہے کہ یہ کام مردوں کے بس کا نہیں۔ ازل سے مرد ہی زلفِ پریشاں کو سنوارتا آیا ہے۔" ہیرو نے احتجاج کیا۔
"کاغذ پر ہی سنوارتے ہوں گے۔" چمپا نے چڑ کر کہا "اتنی دیر ہو گئی... اور تم نے میرا سر دکھانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ بال تو ویسے ہی الجھے ہوئے ہیں۔"
"میں زلفِ پریشاں کو سنوارنے کی بات کر رہا تھا، ابابیل کے گھونسلے کی نہیں۔" ہیرو نے بے حد باوقار انداز میں کہا۔

www.BooksPK.com

کام بالکل نہیں کر سکتے۔ بس، شاعری کروالو تم سے۔ ہنہہ۔ زلفِ پریشاں سنواریں گے گیسو کہیں کے۔"

ہیرو جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تانیا نے اس کے ہاتھ سے کنگھی لے لیا اور بولی۔ "اچھا بس... اب تم چمپا کے بالوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔"

"اس کے بالوں کی تو مجھے فکر ہے ہی نہیں۔ میں تو بے چاری جوؤں کے لیے پریشان ہوں۔"

"کیوں... کیا پریشانی ہے تمھیں؟" چمپا چیخ کر بولی۔

"بھوکی مر رہی ہوں گی بے چاریاں۔"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟" چمپا کا لہجہ بے حد خراب تھا۔

"ان کی غذا مغز ہوتا ہے... اور وہ ہے ہی نہیں تمھارے پاس۔ تمھارا یہ خوب صورت سر بالکل خالی ہے۔" ہیرو نے جواب دیا اور چمپا کا ہاتھ حرکت میں آنے سے پہلے ہی غوطہ لگا گیا۔ چمپا دیر تک زیرِ لب اسے بُرا بھلا کہتی رہی۔ تانیا بڑی نرمی سے اس کے الجھے ہوئے بال سلجھاتی رہی۔

"بال اوپر کر کے باندھنا۔ میں بالوں کے آنکھوں میں آنے سے عاجز آ چکی ہوں۔" چمپا نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو چمپا۔ میں پونی ٹیل باندھوں گی۔ پھر تم دیکھنا... تم کتنی اچھی لگتی ہو۔" تانیا نے بے حد پیار سے کہا۔

چمپا نے پہلی بار اسے ممنونیت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ "تمھارے بارے میں میرا پہلا تاثر اچھا نہیں تھا لیکن تم ٹھیک ٹھاک لڑکی ہو۔" اس نے تبصرہ کیا۔

تانیا بڑے انہماک سے اس کے سنہرے بالوں میں الجھی رہی۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہاں کچھ تماشائی بھی موجود ہیں۔ اس کے نزدیک وہ کوئی ایکٹ نہیں تھا۔ وہ تو جیسے اپنی ایک نخریلی سہیلی کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چمپا کے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے وہ بار سنگھار کا ایک مشہور گیت بھی گنگنا رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے بال بناتے وقت ہمیشہ وہی گیت گنگناتی تھی۔ اس گیت میں بلا کی کشش اور سحر تھا... بے حد مترنم گیت تھا وہ۔ اس پر تانیا کی بے ساختگی اور انہماک۔ اس ایکٹ نے لوگوں کے دل چھو لیے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایکٹ نہیں تھا۔

اسی وقت گولو نمودار ہوا... اور اس نے ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے راگی نمودار ہوا...... اور تانیا کے ساتھ آواز ملانے لگا۔ پھر چالباز کے آنے کے بعد تو گویا سماں بندھ گیا۔ چمپا تال دے رہی تھی۔ یہ آواز دور دور تک گئی... اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ ہر شخص سحر زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ گانا ختم ہوا اور ہیرو نے تماشائیوں کی تالیوں کے جواب میں جھک جھک کر آداب کیا تو تانیا اس سحر سے نکلی۔ اس نے حیرت سے مجمع کو دیکھا۔ لیکن اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ وہ بھی تماشائیوں کی داد کا جواب دے۔ وہ حیران سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ گولو کاسہ لے کر تماشائیوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ لوگ کاسے میں سکے اور نوٹ ڈال رہے تھے۔ تانیا اسٹیج کی طرف پلٹی... لیکن تمام پتلیاں رخصت ہو چکی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب سب تماشائی رخصت ہو گئے تو ہیرو اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے تانیا کے سامنے اپنے نئے کھیل کا چارٹ پیش کیا۔ "میں ہیرو ہوں۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میں چمپا سے محبت کرتا ہوں لیکن چمپا کی ماں بہت لالچی عورت ہے... اور چمپا پوری طرح اس کے اختیار میں ہے۔ چمپا کی ماں کا کردار بُوا تمیزن کرے گی۔ بُوا تمیزن نے دولت مند راگی کو چمپا کے لیے پسند کر لیا ہے جو کہ بوڑھا ہے۔ میرا دوست چالباز چمپا کو اغوا کرنے کے لیے رستم کی خدمات حاصل کرتا ہے لیکن چالباز پہلے ہی سے بوڑھے راگی کا آلۂ کار ہے۔ وہ سازش کرتا ہے، جس کے نتیجے میں رستم چمپا کے بجائے اُس کی ماں کو اٹھا لاتا ہے۔ چالباز اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ راگی کو بھی دھوکا دیتا ہے.... اور خود چمپا کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کرتا ہے...۔"

اس ڈرامے میں تانیا کو مختلف اور متعدد [illegible] میں صرف ایک [illegible] تھی۔ اس کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ تمام تبدیلیوں کے بارے میں تماشائیوں کو آگاہ کرتی... وہ تماشے اور تماشائیوں کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتی تھی۔

ریہرسل کے دوران تانیا کی ایک اور صلاحیت سامنے آئی۔ برجستگی اور بے ساختگی کے علاوہ وہ بلا کی حاضر جواب بھی تھی... اور بعض اوقات ایک سچویشن کو اس طرح موڑ دیتی تھی کہ اس میں سے کئی دلچسپ سچویشنز نکل آتی تھیں۔ یہ بات تو پہلے ہی سامنے آ چکی تھی کہ وہ تماشے کے دوران گرد و پیش کو... بلکہ خود کو بھی بھول جاتی ہے... تماشے کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان کٹھ پتلیوں کو محض کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان سمجھتی تھی۔ اس کے ذریعے، غیر محسوس طریقے سے وہ یقین تماشائیوں کو بھی منتقل ہو جاتا تھا۔ کسی بھی ڈرامے کی کامیابی کے لیے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ تماشائی اسے ڈرامے کے بجائے حقیقت سمجھے... بلکہ خود کو اس میں شامل بھی سمجھے۔

تانیا میں یہ غیر معمولی خوبی موجود تھی۔ وہ اپنے یقین کے زور پر ہر [illegible]

اُس رات کھیل ختم ہوا تو تمام کردار کئی کئی بار رنگ بدل چکے تھے۔ کھیل کے اختتام پر رومانی جوڑوں کی ترتیب کچھ یوں تھی۔ ہیرو اور چمپا، راگی اور بُوا تمیزن... رستم اور تانیا۔ رستم پورے کھیل کے دوران مسلسل الجھنوں سے دوچار رہا۔ تمام کردار بار بار رنگ بدلتے رہے تھے۔ وہ ویسے بھی سادہ لوح تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے... کس کا ساتھ دے۔ ہر بار تانیا ہی نے اس کی مدد کی۔ چنانچہ کھیل ختم ہوتے ہوتے وہ تانیا کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔

اس رات گولو کے کاسے پر جیسے پیسہ برسا۔ مفلس خان اور اس کے کنبے نے اس سے پہلے کبھی اتنی کمائی نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس رات پورے کنبے کی ترقی ہوئی۔ مفلس خان کو مدتوں کے بعد پہلی بار رات گزارنے کے لیے چھت میسر آئی۔ اس نے ایک سستے سے ہوٹل میں کرائے پر کمرہ لیا... اور آرام دہ بستر پر شان سے سو گیا۔ انعام و کرم نوازی اس نے تانیا کو کمرے میں فرش پر ایک چادر بچھا کر سونے کی... اور گولو کو گاڑی میں سونے کی اجازت دے دی۔ گولو کو گاڑی تک محدود کرنے کا ایک مقصد گاڑی اور تمام سامان کی حفاظت بھی تھا۔ جہاں تک تانیا کا تعلق تھا تو وہ آمدنی میں اس وقتی اضافے کا سبب تھی لیکن مفلس خان نے شکریہ ادا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس رات اس نے کھانا بھی ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے دوران وہ وقتاً فوقتاً تانیا کو نظرانداز کرتا رہا لیکن جب تانیا کی نگاہوں کی گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اس نے نظر اٹھا کر تانیا کو دیکھا اور غرایا۔ "تمھاری کارکردگی بہت خراب تھی۔ جب ہیرو نے تم سے چمپا کا دل جیتنے اور اسے حاصل کرنے کی ترکیب پوچھی تو تم جواب دینے کے بجائے بے وقوفوں کی طرح اسے تکنے لگی تھیں۔ کیوں؟"

تانیا نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص کسی حال میں بھی خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ناراض، بد دماغ اور بد زبان معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے نفرت کے اظہار کے لیے بولنے کی ضرورت بھی نہ ہو۔ اس کا وجود برہمی اور نفرت۔ تانیا کے نزدیک اس کے اور اس کے دوستوں کی پُرسکون زندگی میں مداخلت کے مترادف تھی۔

"میں جانتی تھی کہ ہیرو مجھ سے مشورے کا خواہاں نہیں ہے۔" اس نے پوری سچائی کے ساتھ کہا۔ "اس نے مجھے اپنے شو میں شامل کرنے سے پہلے ہی مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں اس کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کروں گی۔ پھر میں جانتی ہوں کہ محبت تو وہ کرتا ہے... وہ چمپا کو پسند بھی نہیں کرتا کیوں کہ...۔"

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کیوں کہ اس کی نظر آذر کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔ [illegible]

"تمھیں کیا معلوم کہ ہیرو کس سے محبت کرتا ہے اور کس سے محبت نہیں کرتا؟" وہ بُری طرح چلایا۔ "تم بہت بے وقوف ہو۔"

ایک لمحے کے لیے تانیا کو ایسا لگا، جیسے وہ کھانے کی پلیٹ اس کے منہ پر دے مارے گا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس شخص سے الجھنا... اسے کچھ سمجھانا بے سود... بلکہ مخدوش ہو گا۔ اب اسے اپنے دوستوں سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ "مجھے معاف کر دیجیے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "یقیناً میرا اندازہ غلط ہو گا۔ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

آذر کا غصہ سرد نہیں ہو سکا لیکن اب تانیا پر برسنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ گولو کی شامت آ گئی۔ "تم کب تک یہاں بیٹھے ٹھونسے جاؤ گے، دجّال؟" اس نے چیخ کر کہا۔ "تین دن کا کھانا تو ٹھونس چکے ہو۔ تمھاری ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔ دفع ہو جاؤ۔ کیا میرا اسٹال چوری کروانے کا ارادہ ہے؟"

"معاف سر، غلطی ہو گئی۔" گولو نے بُرا مانے بغیر کہا اور اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ تانیا نے شکر ادا کیا کہ آذر نے کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ریسٹورنٹ میں ہوتا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ گولو کے جانے کے بعد وہ چند لمحے خاموش بیٹھی اپنا حوصلہ مجتمع کرتی رہی۔ بالآخر ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔

"جناب... آپ ہمیشہ اتنے غصے میں کیوں رہتے ہیں؟"

آذر نے لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا اور سرد نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ "اس لیے کہ تم بے وقوف ہو۔" اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ "اور میں بے وقوفوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا... خاص طور پر بے وقوف عورتوں کے ساتھ.... اور ہاں... یہ آپ جناب نہیں چلے گا۔ میرا نام آذر ہے... اور میں جھوٹی عزت سے بڑھ کر عزت کے نام سے چڑتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کو آذر صاحب کہہ لوں گی۔" تانیا نے اختلاف میں بھی اتفاق کا پہلو نکالا۔

"ہرگز نہیں۔ یہ صاحب بھی نہیں چلے گا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے جناب... معاف کیجیے گا...۔" وہ بُری طرح گڑبڑا گئی۔

"تو تمھیں ضرورت ہی کیا ہے مجھے پکارنے کی؟ اور مجھے تمھارا نام بھی پسند نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے عورتوں کے نام ہی اچھے نہیں لگتے۔ نام کی ضرورت ہی کیا ہے عورتوں کو؟" آذر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

تانیا کا دل ٹوٹ گیا... لیکن اس نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کر لی تھی کہ دنیا کا کوئی مرد [illegible]

www.BooksPK.com

تھی کہ وہ ہر شخص کے لیے اس حد تک ناقابلِ قبول ہے کہ اس کا نام تک نفرت بھڑکنے کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ .... وہ بے وقوف ہے بلکہ آخری ناکامی کے بعد تو اس کا اپنی فنکارانہ صلاحیت پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے بلا ارادہ اپنا ہاتھ آذر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بے حد شیریں لہجے میں بولی: "آپ میرے لیے ہیرو، مرا گو سے، پروفیسر عقل مند اور چالباز کی طرح مہربان ثابت نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ میں انتہائی بے وقوف لڑکی ہوں لیکن انھوں نے کبھی یہ بات میرے منہ پر نہیں کہی..... کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔"

اس کے ہاتھ کے لمس نے آذر کو اور بھڑکا دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا، جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو: "میں بھی تمھارے لیے مہربان ثابت ہو سکتا تھا۔" اس نے پھنکار کر کہا: "لیکن مجھے تمھاری ان گھور تی آنکھوں اور روتی بسورتی معصومیت سے نفرت ہے، سمجھیں؟"

اس کا یہ وار اس قدر ظالمانہ تھا کہ تانیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئی۔

"اور جہاں تک اُن کا تعلق ہے، وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔" آذر نے مزید کہا: "میں ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ تمھیں پسند کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ لیکن تمھارے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ مجھ سے ذرا دور ہی رہو۔ سمجھ گئیں؟"

تانیا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "کوشش کروں گی۔"

**

آذر کے خراب اور بے رحمانہ رویے کا تانیا پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگی۔ اسے اس پر ترس آتا تھا کیوں کہ وہ اپنی نفرت، محرومی اور غصے کے حصار میں محصور تھا..... اور ان منفی جذبوں کی سنگین دیواروں سے سر پھوڑنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ اندر سے بے حد مجروح ہے..... لہولہان ہے۔ دوسری طرف منعتی نمائش میں گزرنے والا وہ ایک ہفتہ اسے اپنی زندگی کا خوشگوار ترین عرصہ محسوس ہوتا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ساتوں کٹھ پتلیوں کے ساتھ اس کے تعلق کی گرم جوشی میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ انھیں بہتر طور پر سمجھنے لگی تھی..... ان کی مزاج آشنا ہو گئی تھی۔ وہ ان کی کمزوریوں اور ان کی فطرت کے مثبت پہلوؤں سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ ہیرو بے حد اولوالعزم تھا۔ اس کی خواہشات بلند تھیں اور ان کی کوئی حد بھی نہیں تھی۔ اس کا تخیل بے حد زرخیز تھا..... لیکن وہ شو کا انچارج ہونے کی حیثیت سے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی خواہشات اور تخیلات کو کبھی بے لگام

نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی ذمے داریوں کا خیال رہتا تھا۔ مراگو خود پسند ہونے کے باوجود طبعاً مہربان آدمی تھا۔ تمام کٹھ پتلیوں میں خود پرست اور مغرور چپا ہی ایسی تھی، جس کی فطرت میں مہربانی نہیں تھی۔

دیو قامت رستم اُس پیرا انحصار کرنے میں سب سے آگے تھا۔ وہ انتہا بے وقوف اور نرم دل تھا کہ ہر شخص اُسے بہ آسانی اُلّو بنا دیتا تھا..... اور خوفناک حد تک جاندار ہونے کے باوجود وہ کسی کو خود سے خوف زدہ نہیں کر پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے تحفظ اور اپنی مدد کے لیے تانیا کی طرف دیکھتا۔ اس کے اور تانیا کے درمیان ہونے والے مناظر تماشائیوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتے تھے۔ تانیا کے انداز میں اس کے لیے ہمیشہ ایک ایسا نرم اور مہربان جذبہ ہوتا، جسے مامتا سے قریب تر کہا جا سکتا ہے۔

تانیا کی بُوا تمیزن سے بھی خوب بنتی تھی۔ بُوا ایک ایسی عورت تھی، جس نے نہ صرف زندگی کو برتا تھا بلکہ وہ خود بھی زندگی کے ہاتھوں برتی گئی تھی۔ وہ بے حد تجربے کار اور جہاندیدہ تھی۔ وہ کئی شوہروں کو لحد میں اُتار چکی تھی، لہٰذا مردوں کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتوں کو اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے باہم تعاون کرنا چاہیے۔ وہ تانیا کو مشورے دینے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتی۔ طبعاً وہ بے حد افواہ پسند تھی۔ تانیا کو ہمیشہ اس سے اسٹیج سے ہٹ کر ہونے والی ...... کے متعلق معلومات ...... نہیں۔ اگر ...... میں ...... لیکن پھر بھی تانیا کو عموماً ایک آدھ کام کی بات معلوم ہو ہی جاتی تھی۔ کٹھ پتلیاں اسٹیج سے ہٹ کر بھی بہت فعال اور سرگرم زندگی گزارتی تھیں۔

لیکن اگر تانیا سے پوچھا جاتا کہ اسے سب سے اچھا کون لگتا ہے تو وہ یقیناً چالباز کا نام لیتی۔ چالباز کی فطرت اسے بہت گہرائی میں کہیں چھو لیتی تھی۔ وہ عیّار تھا، لالچی تھا، بددیانت تھا..... اور یہ بات خود بھی جانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سُدھر جائے..... اور وہ اس سلسلے میں کوشش بھی کرتا تھا لیکن اپنی فطرت سے جیتنا اس کے بس کی بات نہیں تھی..... یا شاید اس کی کوشش میں خلوص کی کمی تھی۔ تانیا کو اس کے ساتھ بہت لطف آتا تھا۔ وہ اُسے تنگ کرتا، بے وقوف بناتا۔ کبھی کبھی وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا..... لیکن جب بھی موقع آتا تو یہ بات بھی ثابت ہو جاتی کہ وہی اُسے سب سے زیادہ چاہتا بھی ہے..... اور اس کی محبت کی سب سے زیادہ ضرورت بھی اُسی کو ہے۔ وہ ڈینگیں بھی بہت بڑھ چڑھ کر مارتا۔ ایک موقع ہمیشہ ایسا آتا، جب وہ تانیا کے دل کو چھو لیتا..... اور تانیا کو خوشی میں بھیگ جانے کا احساس ہوتا۔ مالیا

اُس وقت ہوتا، جب اس کی ظاہری شخصیت کا وہ خول چٹخ جاتا، جو ہر اچھائی کو رد کرنے، ہر اچھائی کا مضحکہ اُڑانے اور نفرت کرنے کا عادی تھا..... جب اس کی ظاہری شخصیت میں دراڑیں پڑ جاتیں۔ اور تانیا کو اُن دراڑوں سے اُس کے اندر چھپا وہ بچہ صاف نظر آتا، جو چاہتا تھا کہ اُسے اس کی خطاؤں پر معاف کر دیا جائے..... اُسے چاہا جائے..... وہ بچہ جو محبت کا طلب گار تھا لیکن پھر وہ دراڑیں ذرا ہی دیر بعد جیسے کسی خود کار عمل کے تحت بھر جاتیں اور وہ پھر پرانا والا چالباز بن جاتا۔

پروفیسر عقل مند تانیا کا مشیر بھی تھا اور بہت اچھا دوست بھی۔ اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتی بھی تھی۔ کھلونوں کا خالق اور مسیحا صرف مہربانی کی نہیں بلکہ انصاف کی علامت بھی تھا..... اور اس معاملے میں وہ بے حد سخت تھا۔ اس کی نظر میں گہرائی تھی۔ تانیا کو اس کی نگاہیں اپنے وجود میں اُتر کر کچھ ٹٹولتی..... کچھ بھید دریافت کرتی معلوم ہوتیں اور وہ ڈر جاتی۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ اُس کے چور خیالات تک پڑھ لیتا ہے۔ یہ محض احساس تھا..... کیوں کہ وہ تو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کے پاس کچھ چور خیالات بھی ہیں۔ ابھی وہ خود سے آگاہ ہی کہاں تھی۔

پھر گولو تھا، جو اس زمانے کی یاد دلاتا تھا، جب انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کے غلام ہوتے تھے۔ وہ آقا کا غلام تھا..... وہ کٹھ پتلیوں کا غلام تھا..... اور ان کی ہر خدمت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ ...... بھی ...... ساتھ ...... ہو گئی تھی تو اس نے از خود اس کی غلامی بھی قبول کر لی تھی۔ تانیا اس سے ادب و احترام سے بات کرتی تو وہ بے حد حیران ہوتا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں ایک عجیب سا جذبہ چمکتا..... اور ساتھ ہی اس کے غلامانہ انداز میں اور شدت آ جاتی۔ اس کی زندگی بھی عجیب تھی۔ وہ پتلی تماشے کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ وہ پردے کے پیچھے آقا کا ہاتھ بٹاتا..... پتلیوں کے لباس تبدیل کرتا..... انھیں ترتیب سے لٹکاتا تاکہ اسٹیج پر کردار اس تیزی سے نظر آئیں کہ تماشائیوں کو ڈوریاں ہلائے جانے کا احساس ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ سامنے والے حصے میں میوزک ڈائریکٹر کے فرائض انجام دینے کے لیے جاتا، جہاں تانیا بھی موجود ہوتی، تو وہ اُن کٹھ پتلیوں کو جیتے جاگتے انسان سمجھتا..... جیسے وہ اس کی اور تانیا کی طرح سچ مچ کے ہوں۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی..... اُن کو چھو کر برت کر بھی اُن کے وجود پر اس کے یقین میں کمی نہیں آتی۔

کٹھ پتلیوں کے وجود پر یقین تانیا اور گولو کے درمیان ایک قدرِ مشترک تھا لیکن دونوں کے یقین کے اسباب اپنی بنیاد میں بالکل

زندگی کے تند و تیز طوفان میں اُس کے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پناہ گاہ نہ ہوتی تو طوفان اُسے بہالے جاتا۔ ان کے وجود ہی نے اُسے موت سے زندگی کی طرف کھینچ لیا تھا۔ پھر اس یقین کے پیچھے منطقی وجوہات بھی تھیں۔ اس نے پتلی تماشے کا صرف تذکرہ سنا تھا، دیکھا کبھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پتلی تماشے کا طریقۂ پیشکش کیسا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے آذر کو نہ کبھی اسٹال میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور نہ نکلتے۔ اس اعتبار سے آذر اُسے مجنون مزاج اور پُراسرار لگتا تھا کہ اس کی آمد و رفت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ سارا دن اسٹال میں پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس طرح گزار دیتا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اُس کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ اس عرصے میں کوئی ایک پتلی بھی اسٹیج پر نظر نہ آتی۔ یہ بات تانیا کو بہلانے کے لیے کافی تھی کہ آذر ہی کٹھ پتلیوں کو نچاتا ہے لیکن وہ یقین کہاں چھپتی تب تک جب آدمی کسی بات کو رد کرنے پر تُل جائے تو وہ سامنے کی حقیقتوں کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ مفلس خان اور اہلِ خانہ میں صرف ہیرو کی چلتی تھی۔ آذر خود کبھی کوئی ہدایت نہ دیتا۔ اُسے جو کچھ بھی کہنا ہوتا..... جو کچھ بھی کروانا ہوتا، وہ ہیرو کے ذریعے کہلواتا۔ ہیرو ہی پلاٹ تیار کرتا، ریہرسل کرواتا، نئے نغمے منتخب کر کے اُن کی دُھنیں بنواتا اور وہی ہر کٹھ پتلی کے لیے کردار کا انتخاب کرتا۔ اب تانیا کے لیے ان کٹھ پتلیوں سے گفتگو کرنا فطرتِ ثانیہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ اُن سے گفتگو کیے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سب فطرت اور مزاج کے اعتبار سے اتنے مختلف تھے کہ ایک رنگا رنگ گلدستہ معلوم ہوتے تھے۔ تانیا انھیں ایک چڑچڑے، بددماغ، بدتمیز اور بدزبان شخص سے کیسے منسوب کرتی۔ اُسے اُن کا خالق کیسے تسلیم کرتی۔

ایک ہفتہ گزرنے پر میلہ ختم ہو گیا اور تین دن تک آوارگی کا دور چلتا رہا۔ وین اِدھر اُدھر بستی بستی اور گلی گلی بھٹکتی پھری۔ جب آذر کا موڈ ہوتا، تماشا بھی ہو جاتا۔ ایک بات بہرحال طے تھی، مفلس خان اور اہلِ خانہ کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اب آذر تانیا کے لیے بھی علیحدہ کمرہ لینے لگا تھا۔ تانیا بہت خوش تھی۔

پھر ایک رات عجیب سانحہ گزرا۔ آذر نشے میں بدمست، لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور تانیا کے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا..... رات بہت ہو چکی تھی اور آذر کو بے وقت بھوک لگی تھی۔ دوسری بھوک..... اس وقت اُسے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچتا اور کڑھتا رہا۔ پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ اس کے غلاموں میں ایک غلام کا اضافہ بھی تو ہوا ہے۔ ہاں..... تانیا اُس کی جاگیر ہی تو تھی۔ وہ کمرے کے سامنے ٹھہر گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی

www.BooksPK.com

کیا پھول بنتا تو ہر کلی کے لیے اعزاز ہوتا ہے اور پھر ایسی کلی جو پھول بننے سے پہلے مرجھائی جا رہی ہو۔ اس نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ اب اس کی معصومیت اور بے خبری پر آگہی کے کرب کا دروازہ کھول دیا جائے اور آگہی بھی وہ جو انسانیت کی توہین و تذلیل میں انتظری ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اس عمل میں منفعت کا ایک پہلو بھی نکلتا تھا جو کہ کوئی تعلق ہے غرض ہو وقت بنے اس سے نہیں کہ روٹی خریدی گئی ہے یا چھین لی گئی ہے۔ عجیب کو مفت کی روٹی بڑی اچھی لگتی ہے۔ اس پر ایک کمرے کے کرائے کی بچت۔ دو کمرے غیر ضروری تھے۔ بلکہ یہ زبردست فضول خرچی تھی آذر نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ دو کمرے نہیں لیے جائیں گے۔

لیکن اس شب خون کے پس پردہ ایک تاریک اور پراسرار مقصد بھی تھا۔ اگرچہ آذر کسی کے سامنے اس بات کا اعتراف کبھی نہ کرتا مگر آذر کو تانیا کی شرافت اور معصومیت سے نفرت تھی۔ وہ اُسے اس کی اخلاقی گراوٹ اور پستی کا احساس دلاتی تھی۔ یہ احساس اُسے اُسی وقت ہو گیا تھا جب اس نے تانیا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اب وہ اس سلسلے میں مزید اذیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُسے اپنی سطح پر لانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور چند لمحے سن گن لیتا رہا۔ پھر اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

تانیا اگلی صبح جاگی تو کمرے میں اتری ہوئی دھوپ اُسے ڈراؤنے خواب جیسے اس سانحے کی نفی کرتی محسوس ہوئی جو رات اس پر گزرا تھا۔ اس سانحے کے بعد اس کا خیال تھا کہ اب وہ سو نہیں سکے گی۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کا دکھتا ہوا جسم نیند کے پرسکون پانیوں میں اتر گیا تھا اور اب صبح ہو چکی تھی۔

وہ بستر سے اُٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے باہر سڑک کی طرف جھانکا اور حیران رہ گئی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی وہاں۔ اس کی رونق لُٹنے سے دنیا کی رونق پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے اپنا گھر، باپ اور ماں یاد آگئے۔ ماضی کی خوشگوار یادیں یوں آئیں جیسے اس کے زخم تذلیل پر مرہم لگانے آئی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے وہ خود کو ایک چھوٹی سی بچی سمجھنے لگی جسے کبھی ماں باپ کی محبت اور شفقت اور تحفظ کی چھت میسر تھی۔

پھر ان خوشگوار یادوں کے پیچھے سے گزشتہ رات کی ڈراؤنی یادیں جھانکنے لگیں۔ اس نے آذر کی زیادتی پر نہ کوئی احتجاج کیا تھا نہ مزاحمت۔ وہ رات کی گناہ گار تاریکی میں آیا تھا اور اس تاریکی ہی میں اُسے لوٹ کر چلا گیا تھا اُسے شرمسار چھوڑ کر۔ ذلت اور آلودگی

وہ چونک کر جاگی تھی اور اُسے جاگتے ہی اپنی کیفیت سمجھنے سے پہلے ماضی کا ایک منظر یاد آیا تھا۔ بچپن میں اس نے ایک جسیم بلے کو ایک چھوٹی سی چوہیا پر جھپٹتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ بھی ایک چھوٹی سی چوہیا ہے۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن ڈھلتے چاند کی مدھم چاندنی میں اُسے اپنے قاتل کی ایک جھلک نظر آگئی۔ ایسے وہ جھلک نظر نہ آتی تب بھی وہ اُسے پہچان لیتی۔ اس کی جبلت اسے بتا دیتی۔ گزشتہ کئی روز سے اسٹال میں پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے آذر کی نگاہیں اُسے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں اور فطرت نے بڑے مبہم اور ناقابل فہم انداز میں اسے بتا دیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

ایک لمحے کے لیے تو جیسے اس کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اس نے سوچا شاید آذر اس سے محبت کرتا ہے۔ اُسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس صورت میں وہ اس کے لیے سب کچھ قربان کر سکتی ہے لیکن جب چاندنی میں اس نے آذر کی آنکھیں دیکھیں تو اس کی خوش فہمی دور ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی روشنی نہیں تھی بلکہ اس کے دل کی تاریکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر محبت بھری سرگوشیاں نہیں تھیں بلکہ نفرت اور ہوس کی پھنکاریں تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ چیخنا چلانا بے سود ثابت ہو گا۔ سوائے اس کے کچھ بھی تو نہ ہوتا کہ وہ سر چھپانے کا آخری ٹھکانا بھی کھو بیٹھتی۔ اس کے بعد وہ کہاں جاتی؟ پھر آذر نے اُسے موقع ہی کب [illegible] وہ کچھ کرتی [illegible] اس کے ہوش و حواس اس کے [illegible] تھا۔ اس کے انداز میں اتنی دہشت اور دیوانگی تھی کہ تانیا کی ذہنی اور روحانی اذیت دو چند ہو گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ مر جائے گی۔

پھر وہ چلا گیا، اُسے شرمسار چھوڑ کر۔ تانیا کو اپنے لٹنے کا غم نہیں تھا۔ اُسے تو بس یہ غم تھا کہ مانگنے والے نے محبت سے کچھ نہیں مانگا۔ بلکہ ڈاکو بن کر لوٹ لیا۔ صرف یہی نہیں، اس نے آذر کی جارحیت کے پیچھے اپنے لیے نفرت بھی چھپی ہوئی دیکھی تھی۔ اُسے اُمید کی ایک کرن بھی نہیں دکھائی دی تھی کہ اس کے اور آذر کے درمیان نفرت اور بیگانگی کی خلیج کبھی پٹ سکے گی۔ آذر کے سینے میں شاید انسانی دل تھا ہی نہیں۔

تانیا کو ایک بات اور پریشان کر رہی تھی۔ ذلت اور اذیت اُٹھانے کے باوجود آذر کے لیے اس کی پسندیدگی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اب تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے لازم ہو گیا ہے جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو چکی ہے۔

وہ دیر تک ان تاریک یادوں، سنگین خیالوں اور خوفزدہ کرنے والی سوچوں میں اُلجھی رہی۔ لیکن نہاتے وقت اُسے ایسا محسوس ہوا

www.BooksPK.com

غسل خانے سے تر و تازہ نکل کر اب وہ تانیا بر تقدیر تھی اور آنے والا ہر لمحہ اس کے لیے جو کچھ لانے والا تھا اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔

اور پھر یوں ہی ایک معجزہ رونما ہوا جس نے اُسے نئی زندگی دی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اور دنوں کی طرح ایک عام سا دن ہے۔ اس کے ساتھی اس کے دوست اب بھی اس پر مہربان تھے بلکہ پہلے سے زیادہ مہربان تھے۔ حسب معمول ہیرو نے چہکتی ہوئی آواز میں اس کا استقبال کیا۔ "ہیلو تانیا... کہاں ہو تم! تمہیں پتا بھی ہے۔ آج ناشتے میں حلوہ ملے گا۔" پھر اس نے گوگو کو پکارا۔ "گوگو... اے گوگو! تانیا کو اس کے حصے کا حلوہ لا کر دو۔"

اسٹال کے عقب سے گوگو نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ پلیٹ میں پوریاں تھیں اور اوپر والی پلیٹ میں حلوہ رکھا تھا۔ اسی وقت چالباز اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوری تھی جس پر تھوڑا سا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے پوری تانیا کی طرف بڑھائی۔ "اے لڑکی... یہ میں نے اپنے حصے میں سے تمہارے لیے بچایا ہے۔ حالانکہ مجھے حلوہ بہت پسند ہے...!"

اسٹیج کے نیچے سے ایک احتجاجی چیخ سنائی دی، جسے سن کر ہیرو خوفزدہ ہو گیا۔ اسی لمحے رستم اوپر آگیا۔

"اوہ چالباز... تمہارا بہت بہت شکریہ۔" تانیا چالباز سے کہہ رہی تھی۔ "واقعی تم نے میرے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ تم میرا بڑا خیال رکھتے ہو...!"

"اے... یہ حلوہ پوری کس نے چرایا ہے؟" رستم نے چیخ کر کہا۔ "وہ میں نے تانیا کے لیے بچایا تھا۔"

تانیا نے چالباز کو گھور کر دیکھا۔ "چالباز... یہ تمہاری حرکت تو نہیں ہے...؟"

لیکن اُسے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ چالباز کے چہرے پر خفت اور احساس جرم کی تحریر بے حد واضح تھی۔

تانیا اپنی تمام پریشانیاں اور اذیتیں بھول گئی۔ اس نے سخت لہجے میں چالباز سے کہا۔ "تم رستم کی چیز فوراً اُسے واپس کر دو۔" پھر وہ رستم سے مخاطب ہو گئی۔ "رستم... اب تم مجھے یہ دے سکتے ہو۔"

دیو قامت رستم نے چالباز سے پوری لے کر تانیا کی طرف بڑھا دی۔ "یہ سب صرف اس وجہ سے ہے کہ میں بے حد احمق ہوں۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "چالباز نے مجھ سے یہ پوری یہ کہہ کر لی تھی کہ وہ اپنی پوری سے اس کا موازنہ کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگیا...!"

تانیا نے رستم سے پوری لی اور اس کی پیشانی چوم لی۔ "تم بے چارے رستم!" اس نے پچکار کر کہا۔ "خیر تم کوئی فکر نہ کرو۔ بے اصولی کے مقابلے

ہوں کہ ہم میں بہت سے بے اصول لوگ موجود ہیں۔"

چالباز نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا اور بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں تانیا۔ میں بڑے خلوص سے تمہارے لیے حلوہ پوری بچانا چاہتا تھا۔ میں نے بچا بھی لیا تھا۔ اس کے باوجود میں وہ خود ہی کھا گیا۔"

تانیا نے بے حد تحمل سے اُسے دیکھا لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں تحمل کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔ صبح سے وہ اپنے دل کو جس ان دیکھی آہنی مٹھی کی گرفت میں محسوس کر رہی تھی، وہ آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ اداسی کی تہیں اتر رہی تھیں۔ بچے کو اس کے کھلونے مل گئے تھے۔ "چالباز... تم..." اس نے آہستہ سے کہا لیکن جملہ پورا نہیں کیا۔

چالباز نے بھانپ لیا کہ وہ نرم پڑ چکی ہے۔ اس نے مسکین سی صورت بنائی اور اپنا سر تانیا کی گردن سے رگڑنے لگا۔ اسٹیج کے دوسرے گوشے میں چند لمحوں کے لیے گوگو اور ہیرو نمودار ہوئی اور چالباز سے ان دیکھی گرد جھاڑنے لگی۔ انداز بے حد جارحانہ تھا جیسے چالباز کو جھاڑو سے مار رہی ہو۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اس مکار صورت والے لومڑ پر ایک لمحے کے لیے بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے تانیا کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔ "لیکن تم کہاں سمجھتی ہو۔ سمجھو بھی کیسے! تم نے میری طرح متعدد شوہر قبروں میں کہاں اتارے ہیں۔" میں شادی... جملہ بغیر ایکشن کے اتر گئی۔

اگلے ہی لمحے ہیرو نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھا۔ نوٹ اس نے تانیا کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے لیے ہے تانیا۔ پچھلے ہفتے کی تنخواہ۔" اس نے چہک کر کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو ہیرو؟" تانیا کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ اس لیے تو نہیں..."

"تم اس چکر میں نہ پڑو۔" ہیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تاریخ [illegible] صبح ہمارا اجلاس ہوا۔ اس میں تمہیں حصے دار بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ صدارت پروفیسر نے کی تھی۔ اس نے سینتالیس منٹ تک صدارتی تقریر کی، جس میں یہ قرارداد پاس کی گئی...!"

اس دوران ایک نوجوان لڑکی کو کٹھ پتلیوں سے بڑی سنجیدگی سے ہم کلام دیکھ کر اچھے خاصے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ گویا پتلی تماشا شروع ہو چکا تھا۔

★★

دن گزرتے رہے۔ موسم بدلتے رہے۔ ویرن بستی بستی گھومتی رہی۔ میلوں میں نمائشوں میں پتلی تماشا دکھایا جاتا رہا۔ ایک مہینے سے دوسرے مہینے تک سفر کے دوران لوگوں کے اصرار پر فرمائشی شو بھی

ہوا۔ پولیس والے آتے اور شو کے سلسلے میں اجازت نامہ طلب کرتے۔ ایسے میں انھیں ہیرو، چالباز، جوا تمیزن یا پروفیسر سے مذاکرات کرنے پڑتے۔ ایسے ہر موقع پر تانیا دونوں فریقوں کے درمیان وضاحت کا فرض انجام دیتی۔ وہ سب مل کر پولیس والوں کے بھی دل جیت لیتے۔ یوں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

تانیا کی شمولیت کے بعد اس گھرانے کے دن پھر گئے تھے۔ وہ لوگ ٹھیک ٹھاک کھانا کھاتے۔ فاقوں کا کڑا وقت بیت چکا تھا۔ آذر شب بسری کے لیے کسی سستے سے ہوٹل میں ایک کمرہ لیتا۔ تانیا بھی اسی کمرے میں سوتی جاگتی۔ اذیت کا احساس مدھم ہوتا جا رہا تھا۔ البتہ وہ محبت کے لیے ترس رہی تھی اور محبت وہ جنس تھی جس سے آذر واقف ہی نہیں تھا۔

یوں غیر محسوس طریقے سے تانیا آذر کی ملکیت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ بھی آقا کے غلاموں میں شامل ہو گئی ہے۔

دن گزرتے رہے اور وہ بے حد سحر انگیز دن تھے لیکن راتیں اذیت سے عبارت تھیں۔ آذر اس کے قریب آتا تو بھی اذیت ہوتی اور وہ کبھی پہلو بدل کر اسے نظر انداز کرتے ہوئے خاموشی سے سو جاتا تب بھی اس کا بدن توقعات کے بوجھ تلے خدشات کی تیز ہوا میں کسی سوکھے پتے کی طرح لرزتا۔ وہ جاگتی رہتی۔ خدشات اسے ستاتے رہتے اور کبھی کبھی اس کا بدن جلنے لگتا اور اس کا سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ کبھی وہ کمرے میں آتا تو اس کا یہ حال ہوتا کہ قدم رکھتا کہیں تو پڑتے کہیں اور نشے میں دھت ہوتا۔ ایسے میں تانیا اسے سنبھالتی۔ اس کا خیال رکھتی۔ اسے تھپک تھپک کر یوں سلاتی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو اور پھر خود دیر تک جاگتی اور اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ وہ درمیان میں جب بھی کبھی اٹھتا، وہ اٹھ کر اسے پانی پلاتی اور تھپک تھپک کر دوبارہ سلا دیتی۔ ایک رات آذر کو بخار ہو گیا۔ بخار بہت شدید تھا اور آذر ہذیان بک رہا تھا۔ تانیا نے اس کا ہاتھ تھام کر دیکھا تو لرز کر رہ گئی۔ آذر کے جسم سے جیسے شعلے اٹھ رہے تھے۔ وہ رات بھر پٹیاں بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھتی رہی۔ صبح جب بخار اترا تو آذر نے بڑی نفرت سے اسے دھکیل دیا اور غرا کر بولا "لعنت ہو تم پر۔ تم نے میرا پورا جسم بھگو دیا۔ کیا مصیبت ہے۔" وہ ڈبڈبائی ہوئی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

آذر ان دنوں کچھ زیادہ ہی پینے لگا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی مگر تانیا کو دیکھ کر بھولی بسری تلخ یادیں ابھر آتی تھیں اور وہ ان یادوں کو جام و مے میں غرق کرنے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس اسے ستاتا رہتا تھا لیکن وہ اس احساس کو کوئی مفہوم بھی نہیں دے سکا تھا۔ ایک طرف تو وہ تانیا کو بری طرح نچوڑ رہا تھا۔ اس سے مالی منفعت بھی حاصل کر رہا تھا اور اسے پامال بھی کر رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک ایسا اثاثہ ثابت ہو رہی تھی جس کی قیمت گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس کے لیے روٹی کی مانند تھی جو صرف پیٹ بھرتی ہے اور جواب میں کچھ طلب نہیں کرتی۔ بس ایک بات مایوس کن تھی۔ اتنی پامالی کے باوجود تانیا کی معصومیت برقرار تھی۔ وہ اب بھی کسی اچھوتی کلی کی طرح پاکیزہ، معصوم اور دھلی دھلائی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے جسم کو داغدار کر چکا تھا لیکن اس کی روح کو تسخیر کر کے آلودہ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بات بھی اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی مے نوشی میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

آذر اس کی معصومیت کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تماشائیوں کے تماشے کی طرف کھنچنے کا اصل سبب تانیا کی معصومیت ہی ہے اور اس کی معصومیت ہی تماشے اور تماشائیوں کے درمیان پل کا کام کرتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس معصومیت کے درپے تھا۔ وہ تانیا کو پوری طرح اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی طرح آلودہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے انتہائی خوفناک طریقہ اختیار کیا تھا۔ جیسے لوہے کو توڑنے کے لیے اسے بار بار تپا کر اس پر ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا ہے، وہی ترکیب وہ تانیا پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ رات بھر اس کی تذلیل کرتا اور اس کے باوجود دن میں اس کی کٹھ پتلیاں تانیا کی عزت افزائی کرتیں۔ اس کے زخمی احساس پر مرہم رکھتیں۔ چنانچہ تانیا ہر رات عزت کی راکھ سمیٹنے کی کوشش [illegible] اکٹھی۔ ہر رات آذر اس کی تذلیل کے لیے مختلف حربے اختیار کرتا۔ کبھی اس پر زبان کے کوڑے برساتا۔ کبھی اس کی پٹائی لگاتا اور کبھی اسے یوں برتتا جیسے وہ کوئی بازاری عورت ہو لیکن ہر رات تانیا سونے کے لیے لیٹتی تو جیسے وہ اسی کلی کی طرح معصوم ہوتی جسے پاکیزہ شبنم نے غسل دیا ہو۔ ایسا لگتا جیسے عزت راکھ ہونے کی بجائے کندن ہو گئی ہو۔ آذر رات کے وقت جتنی بے رحمی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتا، دن میں کٹھ پتلیاں تانیا کے ساتھ اتنی ہی محبت اور مہربانی کے ساتھ پیش آتیں۔ آذر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے پتلیوں پر اس کا کنٹرول بالکل بھی نہیں رہا ہو۔

تانیا کا یہ حال تھا کہ وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں رہ رہی تھی۔ اس کے لیے ہر روز مسلسل اذیت اور مسرت کا سفر تھا، جس میں کبھی ایذائیں اس کی ہم سفر ہوتیں اور کبھی روح کو سرشاری میں تر بتر کر دینے والی خوشیاں۔ زندگی کے یہ دو متضاد روپ قدم قدم اس کے ساتھ چل رہے تھے۔

ایک رات آذر نے عجیب انداز میں ضرب لگائی۔ کاری ضرب۔ وہ بہت رات گئے اپنے کمرے میں داخل ہوا لیکن تنہا نہیں بلکہ ایک ادا فروش عورت اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بری طرح مدہوش تھے اور ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آذر نے لائٹ آن کی اور بستر پر لیٹی ہوئی تانیا کو گھورنے لگا۔ تانیا ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

"اٹھو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" آذر نے چیخ کر کہا۔

تانیا نیند سے اٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔

"میں کہتا ہوں، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" آذر پھر دہاڑا۔ "تمہاری صورت دیکھ کر میرا جی متلانے لگتا ہے۔"

تانیا کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ "کیا... کیا مطلب... کہاں جاؤں میں؟" وہ ہکلائی۔

"جہنم میں جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ بس تم اٹھ جاؤ۔ میں دس سیکنڈ میں یہ بستر خالی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک اور طرح کی شرمندگی سے روشناس کرانے والا لمحہ تھا۔ وہ تانیا کے لیے تذلیل کا ایک نیا اور انتہائی بھیانک انداز تھا۔ ادا فروش عورت اسے چڑانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی، جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ یہ سب کچھ اس لیے اور زیادہ توہین آمیز محسوس ہو رہا تھا کہ آذر اسے یوں استعمال کر رہا تھا جیسے وہ پہنا جانے والا کپڑا ہو۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں جو واحد خیال تھا، وہ خودکشی کا تھا لیکن اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں خودکشی کا طریقہ ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہوٹل سے [illegible] آئی۔ اسے [illegible] کہ اسے کہاں جانا ہے۔ سڑک تاریک تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر اسے جلتی ہوئی سگریٹ کا سرا نظر آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ گوتو تھا جو وین کے بونٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تانیا کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کا منتظر رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر تانیا کا ہاتھ تھام لیا۔

"میرے ساتھ آ گڑیا بی بی۔ میں نے تمہارے سونے کا بندوبست کر دیا ہے۔" اس نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ تانیا کا منتظر تھا۔ اس نے آقا کو ایک بازاری عورت کے ساتھ ہوٹل کی طرف جاتے دیکھا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے فوراً ہی وین کے عقبی حصے کی صفائی کر ڈالی تھی۔

اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا۔ تانیا اندھا دھند سیٹ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ سے اس کے لیے کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا اور وہ آنسو گوتو کو دیکھنے کے بعد اس کی آنکھوں میں مچلے تھے۔ وہ سیٹ پر لیٹی اور پھر جیسے اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ قریب ہی کسی گھڑیال نے تین بجنے کا اعلان کیا۔

گوتو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ننھا منا ناتواں ہاتھ تھام لیا اور

لندن کی حادثات بچاؤ کمیٹی نے حسب ذیل تین سفارشات وزارت ٹرانسپورٹ کو بھیجی ہیں۔

۱۔ کم از کم ایک سال کے لیے ڈرائیونگ لائسنس ضبط کر لیا جائے بس یا ٹیکسی کے ڈرائیور کا جس نے ایک مہلک حادثہ کر ڈالا، خواہ غلطی جان دینے والے کی ہو۔

۲۔ ہر بس یا ٹیکسی کے دروازے پر نمایاں جگہ اس وقت چلانے والے یا چلانے والی ڈرائیور کی تصویر لگی ہو، ڈرائیور نمبر، کار نمبر اور لال حروف میں اس اطلاع کے ساتھ کہ گزشتہ بارہ ماہ میں اس ڈرائیور نے کتنے حادثے کیے، ان میں کتنے مہلک تھے۔

۳۔ ہر اس مردانہ یا زنانہ ڈرائیور کو جس نے تین سال تک اوسطاً ہر دن سوا سو میل پرائیویٹ گاڑی چلائی ہو یا ایک سو میل پبلک گاڑی چلائی ہو اور کوئی حادثہ نہ کیا ہو.....

الف۔ سونے کا تمغہ دیا جائے۔

ب۔ اس کی تصویر سرکاری گزٹ میں نمایاں شائع کی جائے۔

ت۔ وزیر اعظم یا کوئین اپنی میزبانی میں ہر سال ایسے ڈرائیوروں کی پر تکلف دعوت کرے۔

ٹ۔ انھیں سرکاری ملازمت مہیا کرے، پنشن کے حقوق اور میڈیکل الاؤنس کے ساتھ۔

ج۔ ایسے تمام ڈرائیوروں کے شوہروں / بیویوں کو چاندی کا تمغہ دیا جائے۔

چمکارتے ہوئے بولا "نہ رو۔" اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ میں اس وقت بلا کی نرمی اور ملائمت تھی۔ "میری بچی! انسان کو ہر حال خدا کی رضا میں خوش رہنا چاہیے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

تانیا کی گریہ وزاری اور بڑھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے آنسو کبھی نہیں رکیں گے۔ جیسے اس کا پورا وجود آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جائے گا۔

گوتو ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔ "تانیا! میری بیٹی تانی۔" اس نے بڑے پیار سے اسے پکارا۔ "تانیا! ادھر دیکھو... دیکھو نا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اس کے التجائیہ اصرار نے تانیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے اور گوتو کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے

www.BooksPK.com

بے یقینی جھلکنے لگی۔ درمیانی سیٹ کے اوپر سے ہیرو اور چالباز جھانک رہے تھے۔

"ہیرو... چالباز...؟" تانیا خوشی سے چلائی اور پھر فوراً ہی افسردہ ہوگئی۔ "میرے دوستو..." لیکن اس نے بات پوری نہیں کی۔ اچانک ہی جیسے اُس کا دل محبت سے معمور ہو گیا۔ یک لخت وہ ساری شکایتیں بھول گئی۔ اب وہ سراپا محبت تھی لیکن اَنا کے زخم میں اب بھی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

ہیرو اور چالباز پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ان کی خاموشی بہت سنگین محسوس ہو رہی تھی۔ اُن دونوں کے درمیان گولو کا چہرہ تھا اور پسینے سے چمکتا ہوا وہ چہرہ بے حد غیر حقیقی نظر آرہا تھا لیکن اس چہرے پر دیوتاؤں جیسی غیر فانی محبت تحریر تھی۔

"یہ میرے کہنے سے نہیں بولتے۔" اس نے ہیرو اور چالباز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے حد اُداس لہجے میں کہا۔ "لیکن تانی بی بی... یہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس لیے میں انھیں یہاں لے آیا ہوں تاکہ تمھیں یہ یاد آجائے کہ تم سے محبت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ تم سے محبت کرتے رہیں گے بی بی۔"

تانیا نے ہاتھ بڑھا کر دونوں کٹھ پتلیوں کو تھام لیا۔ چند لمحے وہ انھیں محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ ان کے بے جان وجود اس وقت اسے خود کو تقویت بخشتے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر اچانک وہ بہت زور سے چیخی۔ "گولو... گولو بابا! آخر وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ وہ اتنا ظالم کیوں ہے؟ اتنا خراب کیوں ہے وہ؟"

گولو جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بڑے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "گولو کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے بی بی۔ گولو جادو کو ایک نظر میں پہچان لیتا ہے۔ آقا بھی جادو کا شکار ہے۔ اس کی روح اس کا جسم چھوڑ دیتی ہے اور اس کے جسم پر کوئی باغی... خراب روح قابض ہو جاتی ہے۔ گولو سب سمجھتا ہے بی بی۔"

تانیا یہ بات سمجھ سکتی تھی۔ رگوں میں دوڑنے والے خانہ بدوش خون کے حوالے سے یہ باتیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ "تو گولو... تم اس سے نفرت نہیں کرتے؟" اس نے پوچھا۔

گولو نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دیا سلائی کی روشنی میں اس کی واحد آنکھ بے حد چمک دار نظر آرہی تھی۔ "نفرت تو کمزوری کی علامت ہے بی بی۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "جو لوگ محبت نہیں کر پاتے، وہ نفرت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ نفرت سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا جو نفرت کا نشانہ ہو۔ اس کے برعکس نفرت کرنے والا ہی خسارے میں رہتا ہے۔"

"پھر بھی بچو، میں نفرت کرتی ہوں اس سے... شدید نفرت... اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔"

گولو نے سگریٹ کا کش لیا اور ایک سرد آہ بھری۔ گرد و پیش میں سناٹا سا سناٹا تھا۔ "ہاں بی بی جی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "کبھی کبھی نفرت کیے بغیر رہا بھی نہیں جاتا لیکن میں یہی کہوں گا کہ محبت نفرت سے بہتر ہے۔ اذیت تو دونوں میں ہے لیکن بڑا فرق ہے۔ محبت کے دکھ حسین گیتوں کی تخلیق کرتے ہیں جبکہ نفرت تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے۔ پھر انسان نفرت کے بجائے محبت ہی کیوں نہ کرے۔ ویسے بھی نفرت کا دکھ انسان کو اندر سے چاٹ ڈالتا ہے۔ جبکہ محبت کا دکھ انسان کو جلا دیتا ہے۔ کندن بنا دیتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے ایک جانی پہچانی دھن فضا میں گونج اٹھی۔ کم از کم اُن لمحوں میں وہ دھن بلا کی تار چھیڑ رہی تھی۔ کائنات میں بس ایک ہی آواز تھی......

'اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دکھ نہ کسی کو دیا کرو...'

گولو ماؤتھ آرگن بجاتا رہا۔ پھر خود بخود... بلا ارادہ تانیا کی آواز بھی اس میں شامل ہوگئی۔ "جو دنیا کا مالک ہے، نام اسی کا لیا کرو..."

تانیا کے دونوں ہاتھوں میں ہیرو اور چالباز تھے اور انھیں گیت کی لے پر جھلا رہی تھی۔ اس کے انداز میں بلا کا آہنگ تھا۔

پہلی بار تانیا کی سمجھ میں گولو کی بات آئی۔ موسیقی اور گیت بہت اہم ہوتے ہیں۔ گیتوں کے بدلے آنسو، اور موسیقی کے ... وجود کے اندر کے شعلے اور دُھوئیں قبول کر ... کا سودا ... اس کے اندر کی تمام نفرت دُھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گیت جیسے اس کے سارے وجود میں گونجنے لگا۔ وہاں صرف گیت ہی نہیں تھا گیت کی بازگشت بھی تھی۔ اس کے علاوہ آذر جیسے قابلِ نفرت انسان کے لیے اس کے وجود میں ایسے نازک جذبے مچل اٹھے تھے، جن سے وہ اب تک ناواقف تھی۔ وہ اب بھی ان جذبوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی۔

گولو جھومتا ہوا ماؤتھ آرگن بجاتا رہا اور وہ گاتی رہی۔ "شیشہ ٹوٹ کے جڑ سکتا ہے، دل نہ جڑے گر ٹوٹے۔ کتنا ہے بے درد وہ انساں، پیار کا گھر جو لوٹے۔ کام نہ ایسا کیا کرو، دکھ نہ کسی کو دیا..." اور ساری کائنات جیسے مسحور ہو کر ٹھہر گئی تھی۔

پھر اچانک گیت ختم ہو گیا۔ ماؤتھ آرگن کی آواز سناٹے میں گھل مل گئی لیکن تانیا کے نیم وا لبوں پر اب بھی وہ گیت بے آواز ہونے کے باوجود تھرک رہا تھا۔ فضا میں اس گیت کی گونج اب بھی موجود تھی۔ تانیا عقبی نشست پر دراز ہوگئی۔ اس نے ہیرو اور چالباز کو اپنے سینے سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن

www.BooksPK.com

کھول دیں۔ کچھ دور گولو کے جلتے ہوئے سگریٹ کا سرا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اُمید کی ننھی سی کرن... ہر طرف بے حد تقدیس آمیز خاموشی اور اندھیرا تھا۔ یہ تاثر تانیا کے لیے بے حد حیرت انگیز تھا۔

***

وہ کاری وار بھی آذر کے سینے میں بھڑکتی ہوئی نفرت کو نہیں بجھا سکا۔ اسے اس عورت سے بھی نفرت اور کراہیت محسوس ہونے لگی جسے اس نے تانیا کی جگہ دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے عورت کو بستر سے دھکیل دیا اور خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ زیر لب گالیاں بکتا رہا۔ ان گالیوں کا ہدف کوئی شخص نہیں تھا بلکہ تانیا کی معصومیت، شرافت اور سادگی تھی۔ وہ اتنے جتن کے باوجود اُسے اپنی سطح پر نہیں لا سکا تھا۔

اگلے روز زہرہ گی اپنے تمام تر معمولات سمیت بیدار ہوئی۔ ہیرو، چالباز اور اُن کے ساتھی اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اسٹال کے گرد بچے جمع ہو گئے تھے۔ پھر کٹھ پتلیوں کی دیکھ بھال اور ترجمانی کے لیے تانیا آئی اور پتلی تماشا شروع ہو گیا۔

اس رات کے بعد بھی پتلی تماشے کا سفر بدستور جاری رہا۔ البتہ ایک تبدیلی ضرور رونما ہوئی۔ اب آذر جب بھی کسی ہوٹل میں ٹھہرتا تو ہمیشہ دو کمرے لیتا۔ تانیا الگ کمرے میں رہتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ تانیا سے گریزاں رہنے لگا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ تانیا سے اس کا سامنا نہ ہو۔

بہرحال، پتلی تماشے کی کامیابی اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ جہاں بھی جاتے، لوگوں کے دل موہ لیتے۔ تانیا کی موجودگی پتلی تماشے کو ناظرین کے لیے محض پتلی تماشا نہیں رہنے دیتی تھی۔ دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگتا، جیسے وہ پتلیاں جیتی جاگتی انسان ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ تماشا نہیں، حقیقت ہے۔ اس بات سے دلچسپی اور بڑھ جاتی کہ تماشا جس علاقے میں ہوتا تمام پتلیاں وہاں کے لوگوں سے بخوبی واقف ہوتیں اور چالباز مقامی لوگوں کے متعلق افواہیں پھیلانے میں پیش پیش رہتا۔ لطف یہ کہ اس کی پھیلائی ہوئی ہر افواہ میں کسی نہ کسی حد تک صداقت بھی ہوتی۔

کبھی کبھی ہیرو سرگوشی میں پکارتا۔ "اے چالباز اور تانیا، ذرا یہاں آؤ۔ مجھے ایک راز معلوم ہوا ہے لیکن خدا کے لیے... خواتین کو نہ بتانا۔ یہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ پندرہ منٹ کے اندر بات پورے شہر میں پھیل جائے گی..."

تانیا لپک کر اس کے قریب جاتی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک ہوتی۔ "راز کی بات... واہ مزہ آگیا ہیرو۔" وہ ہیجانی لہجے میں

کرو، میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔"

چالباز کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہراتی اور وہ منہ بنا کر کہتا۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ راز سن کر منہ بند رکھا جائے۔ تم مجھے بتاؤ ہیرو۔ پھر میں سوچوں گا کہ اس راز کی کتنی قیمت وصول کی جائے اور کیسے کی جائے۔ اگر بلا قیمت ہو تو میں اسے حماقت تصور کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں چالباز۔ یہ راز ایسا نہیں ہے۔" ہیرو کے لہجے میں احتجاج ہوتا۔ "یہ ایسا راز نہیں ہے، جسے ہمیشہ راز رکھا جا سکے۔ بلکہ یہ تو چند روز بھی راز نہیں رہ سکے گا۔ وہ دیکھو۔" وہ تماشائیوں کی طرف اشارہ کرتا۔ "وہ جو پیچھے خاتون ہیں نا۔ ارے وہی، ہوٹل والے صابر کی بیگم۔ پتا ہے، وہ اپنے گھرانے میں اضافہ کرنے والی ہیں..."

"تم گدھے ہو ہیرو۔ یہ راز کی بات ہے۔ ہنہہ۔" چالباز جھنجھلا اٹھا۔ "اب بائیے، یہ راز تو ساری دنیا کو معلوم ہے۔"

"اے چالباز، خبردار۔" تانیا ڈانٹتی۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ تم لوگ بہت بدتمیز ہو گئے ہو۔ لوگوں کے ذاتی معاملات میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔"

اس دوران تماشائی اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ نومولود لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ پروفیسر عقلمند اس سلسلے میں سائنسی دلائل پیش کرتا۔ بوا تمیزن صابر کی بیوی کو مفت مشوروں سے نوازتی۔ رستم پیشکش کرتا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بلا معاوضہ مدد کرے گا۔ تماشائی بے حد خوش ہوتے۔ یہ تانیا کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ ایک ہی بستی میں کئی بار تماشا دکھایا جاتا اور لوگ بار بار آتے اور خود بھی تماشے کا ایک حصہ بن جاتے۔ بچے بالخصوص تانیا سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ تانیا انھیں بتاتی کہ رستم بے ضرر آدمی ہے تو وہ ڈرتے ڈرتے آتے اور رستم سے ہاتھ ملاتے۔ دو ایک جملوں کے تبادلے کے بعد انھیں رستم کے بے ضرر ہونے پر یقین آجاتا اور وہ بے حد خوش ہوتے۔ تانیا انھیں چالباز اور ہیرو سے متعارف کراتی۔ وہ لوگ چالباز کو چھیڑتے اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے اور ہیرو سے گپ شپ کرتے۔

لوگوں کے نزدیک وہ پتلی تماشا بے حد منفرد تھا۔ اس تماشے میں گھسے پٹے آئٹم نہیں ہوتے تھے بلکہ اس میں تخلیقی عنصر بے حد جاندار تھا۔ ہر بار نیا اسکرپٹ پیش کیا جاتا۔

ہنستی گاتی، کھیلتی کودتی اور مکالمے بولتی کٹھ پتلیوں کے ذریعے جیتی جاگتی تانیا ان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ جیسے جیسے پتلی تماشے والوں کا قافلہ بڑھتا گیا، اُن کی شہرت اور مقبولیت شہر بھر میں پھیلتی گئی۔

***

اکتوبر کے دس دن انھوں نے ایک میلے میں گزارے۔ وہ بہت بڑا میلہ تھا اور متمول لوگوں کی بستی سے بہت قریب تھا۔ اسی

ہوئی کہ لوگوں نے ابتدا میں پتلی تماشے کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ اسے فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کچھ لوگ اسٹال کے پاس سے گزرتے ہوئے یونہی رک گئے۔ اس کے بعد تماشے نے انھیں جکڑ لیا اور انھیں اختتام تک رکنا پڑا۔ یوں دو دن کے اندر تماشے کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

میلے کے آخری دن ایک فربہ اندام اور پچکی ہوئی ناک والا شخص اسٹال کی طرف آیا۔ اس نے آتے ہی گوگو سے مطالبہ کیا کہ وہ تماشے کے مالک سے ملنا چاہتا ہے۔ اس وقت پورا پتلی گھرانہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ریہرسل کی تیاریاں کر رہا تھا۔

"اے مسٹر، تم نے ملاقات کا وقت بھی لیا ہے؟" ہیرو نے چیخ کر پوچھا۔

چالباز نے زوردار قہقہہ لگایا اور مضحکانہ انداز میں بولا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ ملاقات کے لیے وقت لینے کے لیے بھی تو ملاقات ضروری ہے اور پھر یہ میرا شعبہ ہے۔ ہیرو... تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟"

اسی وقت چمپا نمودار ہوئی۔ اس نے نووارد کا جائزہ لیا پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "اوہ... میں سمجھی تھی کہ کوئی خوبرو نوجوان ہوگا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو چمپا۔" بوا تمیزن نے سخت لہجے میں کہا۔ "خوبرو نوجوان نہ سہی یہ مردِ رعنا دولت مند بہرحال ہے۔ ذرا دیکھو تو... اس کے جسم پر چربی کی کتنی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ایسی چربی ان لوگوں پر کبھی نہیں چڑھتی جن کی جیبوں میں سوراخ ہوتے ہیں۔"

یہ بات طے تھی کہ فربہ اندام شخص پتلی گھرانے کے افراد پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکا تھا۔ تانیا نے اس سلسلے میں نووارد سے معذرت کی۔ "آج یہ لوگ شرارت کے موڈ میں ہیں۔ آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ خیر... یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

نووارد نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام افسر تھا اور وہ شہر کے ایک بڑے آڈیٹوریم کے لیے شو ایٹمری کی بکنگ کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسی سلسلے میں آیا ہے اور چاہتا ہے کہ پتلی گھرانے کے افراد آڈیٹوریم کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔

یہ سنتے ہی تمام پتلیوں میں ہیجان کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بیک وقت مسرور اور فکر مند نظر آنے لگیں۔ مشوروں، جوابی مشوروں، منصوبہ بندی اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چالباز اسٹیج پر ہسٹریائی انداز میں ناچتا پھر رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ "دیکھو... مجھے دیکھو... میں اداکار بننے والا ہوں۔ بالآخر قوم کو میری صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا ہاہاہا... اور مسٹر افسر، سچ سچ بتاؤ تمھیں یہ خیال میری کارکردگی دیکھ کر ہی آیا ہے نا۔ تانیا، تم نے سنا؟ اب ہم سب اسٹیج پر اداکاری کریں گے۔ میں رانجھے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو... میری ناک بھی رانجھے جیسی ہے۔"

افسر کے لیے وہ ایک نیا اور ناخوشگوار تجربہ تھا۔ راگی نے اس سے اس کا شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات طلب کیے اور ان کا معائنہ کیا۔ پھر اسے بوا تمیزن کی تقریر سننا پڑی جس میں تھیٹر کے ماحول کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا سامنا پروفیسر عقلمند اور وسیر وسے ہوا۔ ان تمام مرحلوں سے گزرتے گزرتے وہ اس بری طرح الجھا کہ پتلی گھرانے والوں سے مجوزہ معاوضے سے زیادہ معاوضے کا معاہدہ کر بیٹھا۔ اس کی آذر سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ معاہدے کے کاغذات مکمل ہوتے ہی ہیرو نے کاغذات پر جھپٹا مارا اور انھیں اسٹیج سے نیچے لے گیا۔ جہاں آذر نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ آذر کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد افسر نے تانیا کو کھانے کی دعوت دے ڈالی کیونکہ وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔

اسی وقت چالباز اسٹیج پر نمودار ہوا اور کاؤنٹر پر کہنی ٹکا کر بڑے جارحانہ انداز سے اسے گھورنے لگا۔ "اے بڑے میاں، ہوش میں تو ہو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمھیں شرم نہیں آتی۔ تانیا کی عمر دیکھو اور ذرا خود کو دیکھو کانوں پر لٹکتے جھ سفید بال لٹک رہے ہیں اور چلے ہیں تانیا کو مدعو کرنے۔ سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ دماغ درست کر دوں گا تمھارا۔"

دوسری طرف سے بوا تمیزن نے ہانک لگائی۔ "اے ہے۔ میں تو پہلی ہی نظر میں تمھاری اصلیت سمجھ گئی تھی... میں نے راگی ... کو بتایا تھا کہ تم ... ہو... اس ... کوئی ہرج ... نہیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تانیا کو دو گے کیا؟ ہیروں کے زیورات کا سیٹ دو گے؟ بنگلا دو گے؟"

"بکو مت لالچی بوا!" ہیرو نے بوا کو ڈانٹ دیا۔ "ہماری تانیا برائے فروخت نہیں ہے۔"

افسر نے کھسک لینے ہی میں اپنی عافیت جانی۔ وہ معاہدہ بغل میں دبا کر بھاگ لیا لیکن چالباز کے قہقہے دور تک اس کا تعاقب کرتے رہے۔

***

تھیٹر والوں سے معاہدہ تین ہفتے کا ہوا تھا۔ وہ عرصہ تانیا کے لیے زندگی کا خوشگوار ترین وقت تھا۔ پتلی گھرانے کے معمولات بدستور رہے۔ ہیرو اور راگی ریہرسل کی نگرانی کرتے لیکن اس بڑی کامیابی نے آذر کو اور زیادہ تند خو اور تلخ بنا دیا تھا۔ یہ احساس اسے مارے ڈال رہا تھا کہ یہ سب کچھ تانیا کی وجہ سے ہے۔ اس اعتبار سے اسے تانیا کا ممنون ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے ممنون ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ممنونیت کا وہ گھٹا ہوا احساس شدید نفرت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو، بہرحال اس نے اس بار نئے کھیل پیش کرنے کے بجائے وہ گھسے پٹے کھیل پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو اس نے ابتدائی ایام میں پیش کیے تھے۔ اس کے باوجود پتلیوں کی کارکردگی بے مثال تھی اور اس اعتبار سے حیرت انگیز بھی کہ وہ ایسے کھیلوں میں حصہ لے رہے تھے جن میں ان کی دلچسپی بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اگر کٹھ پتلیاں بھی جذبوں سے عبارت ہوتی ہیں تو یقیناً ان کٹھ پتلیوں کی کارکردگی کسی توانا جذبے ہی کی مرہونِ منت تھی۔

ریہرسل ختم ہونے کے بعد وہ تانیا کے پیچھے پڑ جاتا اور اس کی کارکردگی پر ناروا تنقید کرتا۔ اس کی گفتگو اور رطب و لہجے میں کیڑے نکالتا اور جب کچھ اور نہ بن پڑتا تو اس کی ظاہری شخصیت اور رنگ روپ پر سفاکانہ تنقید کرتا۔ وہ بار بار اسے یاد دلاتا۔ "میں نے تمھیں ذلت کے گندے نالے سے اٹھایا۔ تم ڈفر لڑکی... تم آداب کب سیکھو گی۔ میں آخر کب تک تمھیں برداشت کروں گا۔" وہ اس کی چال ڈھال، اس کے لباس اور آواز پر تنقید کرتا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹیج پر تانیا کو بری طرح ناکام ہوتا دیکھنے کا خواہش مند ہے لیکن اس سلسلے میں بھی اس کے حصے میں مایوسی ہی آئی۔

شاید اس لیے کہ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کی تخلیق کردہ ساتوں کٹھ پتلیاں اپنی مرضی کی مالک ہیں اور ان کے اور تانیا کے درمیان محبت کا اٹوٹ رشتہ موجود ہے۔

www.BooksPk.com

... عرات کی رات ... اور ... زندگی میں پہلی بار اسٹیج پر نمودار ہوا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شو شروع ہوا تو آذر کو شروع ہی میں اندازہ ہو گیا کہ تانیا اور اس کی دوست کٹھ پتلیوں نے اسکرپٹ بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ وہ سب بے ساختہ اداکاری کر رہے تھے۔ کھیل میں اسکرپٹ نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اس کے باوجود ناظرین کھیل کے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ چالباز ڈرا انجھا بننے کی کوشش میں انھیں ہنسا رہا تھا۔ دوسری طرف رستم تنے سارے تماشائیوں کی موجودگی میں دہشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ بیس منٹ تک وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے اور تماشائیوں کے قہقہے اور تالیاں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتی رہیں۔ ساری ریہرسل دھری کی دھری رہ گئی۔ تانیا سمیت ہر کردار من مانی کر رہا تھا اور وہ من مانی کامیاب بھی ثابت ہو رہی تھی۔ آذر پردے کے پیچھے اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے تانیا کے لیے ایک بے ہودہ لباس تجویز کیا تھا لیکن تانیا اسٹیج پر نمودار ہوئی تو اس نے انتہائی سادہ لباس پہنا ہوا تھا۔ دیہات کے سیٹ کے پس منظر میں وہ لباس نہایت موزوں نظر آ رہا تھا اور اس پر سج بھی رہا تھا۔

> ہو سکتا ہے کہ آج کا نوجوان صحیح طور پر پڑھنا لکھنا جانتا ہو لیکن اس کے سامنے کسی ایکٹریس کا نام لیں تو وہ تمھیں اس کی عمر، اس کی فلموں کے نام اور اس کے شوہروں کی تعداد بتا سکتا ہے۔

تمام کٹھ پتلیاں پہلی بار اسٹیج پر آنے کی وجہ سے بہت زیادہ خوش تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی اس خوشی نے پورے آڈیٹوریم کو جگمگا دیا ہے۔ انھوں نے نت نئے لطیفے گھڑ گھڑ کر سنائے۔ انھوں نے پس پردہ بیٹھے ہوئے آرکسٹرا والوں اور الیکٹریشنز کا مضحکہ اڑایا جو تماشائیوں کے سامنے نہیں تھے۔ تانیا، تماشائیوں کو ان لطیفوں کے پس منظر سے روشناس کراتی رہی۔ قہقہے گونجتے رہے۔ تالیاں بجتی رہیں۔ پتلیوں نے اسپاٹ لائٹس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر ڈالی اور مختلف رنگوں کی اسپاٹ لائٹس طلب کرتی رہیں۔ غرض، اپنے پہلے ہی شو میں انھوں نے تمام روایات کو پامال کر ڈالا۔

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی تانیا بھول گئی کہ وہ کون ہے اور اس وقت کہاں موجود ہے۔ وہ ازخود رفتگی کی کیفیت میں تھی اور صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی سات سہیلیاں اس کے ساتھ ہیں اور اس کے سوا کسی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے انداز کی سچائی نے تماشائیوں کے دل چھو لیے لیکن تماشائیوں کے دل تو صحیح معنوں میں رستم نے جیتے۔ وہ نمودار ہوا اور جیسے ہی اس نے تماشائیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی تو وہ دہشت کے مارے جیسے کسی سنگی بت کی طرح ساکت و صامت ہو گیا۔ وہ انداز اس قدر حقیقی تھا کہ ہال میں موجود ہر شخص دم بخود رہ گیا۔ تانیا نے اسے جھنجھوڑ کر ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ رستم شو کے اختتام تک اسی طرح ساکت رہا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

پھر گوگو اپنے ماؤتھ آرگن سمیت نمودار ہوا۔ "موسیقی کو جادو قرار دیا جاتا ہے۔" اس نے اعلان کیا۔ "ہم ابھی اسی جادو کو آزماتے ہیں۔"

اس نے ماؤتھ آرگن منہ سے لگا لیا۔ مدھر موسیقی فضا میں گونجی اور تانیا کو وہ رات یاد آگئی جب گوگو کے ماؤتھ آرگن نے اس کی ذلت اور دکھ کا مداوا کیا تھا۔ اس کے ہونٹ خود بخود ہلے اور پورا ہال گیت سے گونجنے لگا۔ "اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دکھ نہ کسی کو دیا کرو۔ جو دنیا کا مالک ہے..." پھر اس کی آواز میں آوازیں ملتی گئیں۔ تالیوں کی گونج شامل ہوتی گئی۔ تماشائی بھی تماشے میں شامل ہو گئے تھے

گیت ختم ہونے کے بعد دیو قامت رستم نے سر اٹھایا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جنبش سی ہوئی۔ بالآخر اس نے اعلان کیا۔ "اسے بے وقوفو... میں مجمع سے ڈرتا تھوڑا ہی ہوں۔ تم کیا جانو میں بہت بڑا فنکار ہوں!"

ہیرو نے اچھل کر رستم کا سر تھپتھپایا اور پھر تانیا کا رخسار چوم لیا۔ ہال میں ایسی خاموشی تھی جیسے لوگ پتلی تماشا نہیں بلکہ کسی معبد میں عبادت کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

شو کے دوران اسٹیج کے دائیں طرف ایک خوش لباس اور خوشرو نوجوان کھڑا بڑے غور سے تماشا دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نظریں تانیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا نام جمال تھا اور وہ بازی گروں کے طائفے میں شامل تھا۔ پتلی تماشے کے بعد اس کے طائفے ہی کی باری تھی۔ طائفے کے دوسرے اراکین پتلی تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن جمال صرف اور صرف تانیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس دبلی پتلی لڑکی نے اس کا دل جیت لیا تھا لیکن اس کی ذہانت اسے ایک اور راستہ دکھا رہی تھی۔ اس تماشے نے اور بالخصوص تانیا کی کارکردگی نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی جو تماشائیوں کو سانسیں روک کر بیٹھنے پر مجبور کر سکتی ہے، اگر اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کا اپنا کرتب کس قدر کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ بہت بلندی پر تنی ہوئی رسی پر چلنے کا کرتب دکھاتا تھا۔ اس لڑکی کے شامل ہو جانے پر کرتب میں جان پڑ جاتی۔ وہ تصور میں لڑکی کو اپنی طرف رومال اچھالتے اور خود کو جھک کر وہ رومال پکڑتے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر میں تالیوں کا طوفان تھا۔

پھر تالیوں کی زبردست گونج میں پتلی تماشا اختتام کو پہنچا۔ تالیوں کی وہ گونج موج در موج تانیا کے وجود میں رقص کر رہی تھی۔ اس نے احتراماً ہر پتلی کا سر خم کرایا۔ پردہ تماشے اور تماشائیوں کے درمیان حائل ہوا تو تماشائیوں نے تانیا کی آخری جھلک دیکھی۔ وہ پتلیوں کے اسٹال کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ ایک جانب سے ہیرو اور دوسری جانب سے چالباز اس کی گردن میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے رخسار تانیا کے رخسار سے لگا رکھے تھے۔ تانیا کی آنکھوں میں ستارے اترے ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں اتنی خوش پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔

وہ اسٹیج سے اتر کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تو راستے میں جمال اس کا منتظر تھا۔ "ہیلو، پیاری لڑکی!" اس نے محبت آمیز لہجے میں تانیا کو مخاطب کیا۔ "میں نے زندگی میں بے شمار ایکٹ دیکھے ہیں لیکن تمہارے ایکٹ نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ پلیز... اب تم میرا کرتب دیکھنا اور یہیں ٹھہرنا۔ کرتب کے بعد میں تم سے کچھ بات کروں گا۔"

تانیا نے اس کی نرم خوئی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کی بات مان لی۔ وہ اسٹیج کے پہلو میں کھڑی اس کا کرتب دیکھتی رہی۔ جمال نے ایک بار رسی پر چلتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ تانیا نے بمشکل اپنی چیخ روکی۔ اسے ڈر لگا کہ جمال گر جائے گا۔

اسی وقت آذر اس کی طرف چلا آیا۔ نگاہوں میں بے بسی لیے۔ اس کے اپنے فن کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہاں اسٹیج منیجر کے سوا کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا کہ پتلی تماشے کا کرتا دھرتا وہی ہے۔ وہ تانیا کے پاس رکا اور اس نے تانیا کی نگاہوں کے تعاقب میں جمال کو دیکھا۔ "ہنہ... تیسرے درجے کے بازی گر!" اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا اور تانیا کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ رقاصاؤں کے طائفے کی طرف تھا۔

جمال اپنے کرتب سے نمٹ کر نیچے آیا تو تانیا کو موجود پا کر بے حد خوش ہوا۔ "ہاں اچھی لڑکی! اب بتاؤ، کیا خیال ہے؟" اس نے کہا۔

"واہ!" تانیا نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے تمہارا کرتب بہت پسند آیا۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" اس کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔

"ڈر کیسا۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!" جمال نے جواب دیا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم میرا نیا کرتب دیکھنا، حیران رہ جاؤ گی!"

"پھر بھی یہ خطرناک ہے۔"

"اسی لیے تو لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میرے ساتھ چلو... میں تمہیں چائے پلاؤں!"

تانیا کے چہرے پر خوف کا سایہ سا ابھرا۔ جمال اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "میں... میں... میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا!" تانیا نے گڑبڑا کر کہا۔

"تو کیا وہ تمہارا شوہر ہے، منحوس خان؟" جمال نے تیزی سے حملہ کیا۔ تانیا نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا اور معصومیت سے بولی۔ "نہیں تو!"

جمال نے مزید تفتیش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "تم باہر چلو، میں لباس تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں!" اس نے کہا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تانیا چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا خوبصورت نوجوان اس جیسی بدصورت لڑکی کو چائے پر مدعو کر سکتا ہے۔ دوسری طرف آذر نے آج تک ہر معاملے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اب اس کے لیے عادت بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود کو ان ساتوں پتلیوں کا پابند بھی سمجھتی تھی جنھوں نے آڑے وقت میں اسے سہارا دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اس سلسلے میں ہیرو سے اجازت لینا چاہیے۔ تاہم اس نے ڈریسنگ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ اس دوران وہ سوچتی رہی کہ جہاں دیدہ گوا تیزن سے مشورہ کرنا نہایت مناسب رہے گا کہ ایک اجنبی کی دعوت اس طرح قبول کرنا مناسب تو نہیں ہے لیکن وہ یہ سب سوچتی رہی اور اس پر عمل کیے بغیر باہر نکل آئی۔

باہر جمال اس کا منتظر تھا۔ جینز اور بلیک جیکٹ میں وہ اور زیادہ خوبرو لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا اور اس نے آتی نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما جیسے وہ کانچ سے بھی نازک کوئی چیز ہو۔ تانیا کو مدت سے ایسی نرمی اور ملائمت میسر نہیں آئی تھی۔ مدتوں بعد پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور زندگی بے حد خوبصورت ہے۔ وہ بڑی لاپروائی سے ہنس دی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ "اب ہم کہاں چلیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں جو تمہارے شایانِ شان ہو۔"

وہ ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ میزوں پر شمعیں روشن تھیں۔ مدھم روشنی میں ریسٹورنٹ کا ماحول بے حد خواب ناک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بے فکری سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جمال کی نرم خوئی اور خوش گفتاری غیر محسوس طور پر تانیا کو متاثر کرتی رہی۔ دونوں کی کم عمر سی آنکھیں ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار تانیا زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے جادو کر کے اس رات کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اس رات آسمان پر کوئی ستارہ نہیں رہا تھا۔ سب کے سب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ وہ ان معصوم سی خوشیوں میں اس طرح الجھ گئی تھی کہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ جمال جسے اپنی وجاہت کا احساس تھا، اسے لطیفے سنا کر ہنساتا رہا۔ وہ جوان اور خوبصورت تھا۔ اس کے پاس قصوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ اسے اپنے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

وہ اس وقت اٹھے جب ریسٹورنٹ کے بند ہونے کا وقت آ گیا۔ جمال سرکس کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور بے حد خوش اطوار تھا۔ وہ تانیا کے ساتھ بے حد عزت اور تکریم سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے تانیا کو اس ہوٹل کے دروازے پر خدا حافظ کہا جہاں تھیٹر والوں کی طرف سے ان لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں آذر تانیا کا منتظر تھا۔ وہ ایک کرسی میں دھنسا ہوا تھا اور حسبِ معمول سگریٹ اس کے ہونٹوں کے درمیان جھول رہا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ وہ نشے میں نہیں تھا لیکن اس وقت وہ ہمیشہ سے زیادہ غصے میں لگ رہا تھا۔

"کہاں آوارہ گردی کر رہی تھیں تم؟" وہ غرایا۔ "اب میں تمہیں تنخواہ دیا کروں گا۔ چنانچہ تمہیں آوارہ گردی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

تانیا کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا۔ نفرت کا سیلاب اس شدت سے امنڈا کہ اسے لگا بے ہوش ہو جائے گی۔ اتنے دنوں کے بعد تو اسے ذرا سی آزادی ملی تھی۔ ان معصوم خوشیوں کی بازگشت اس کے وجود میں اب بھی اسرار ہی تھی، جس سے وہ آج لطف اندوز ہوئی تھی۔ شاید یہ اسی بازگشت کا اعجاز تھا کہ وہ آذر کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ "میں جمال کے ساتھ گئی تھی۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے چائے پلانے لے گیا تھا۔"

آذر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اوہ... دو ٹکے کے رسے باز۔ تم اب تک صرف چائے پر ٹرخا رہی تھیں؟"

"تم جیسے ہو، ویسا ہی سوچو گے۔" تانیا نے جواب دیا۔ "لیکن جمال تم جیسا نہیں ہے۔ وہ بہت مہربان آدمی ہے۔"

آذر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے اور نفرت سے مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے تانیا کی کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ وہ چیخ اٹھی۔ "بس۔ سن لو مجھ سے!" وہ دہاڑا۔ "اگر آئندہ میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو میں تمہاری اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

اگلے روز تماشے کے دوران راگی نے تانیا کو ایک تحفہ پیش کیا۔ سینٹ کی ایک شیشی۔ یہ بات سب کے لیے حیرت انگیز تھی، کیونکہ راگی کنجوس تھا۔ اس سلسلے میں دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ تانیا بہت خوش تھی۔ اس سے پہلے اسے کبھی سینٹ کی شیشی میسر نہیں آئی تھی۔ پھر فرمائش ہوئی کہ شیشی کھولی جائے۔ چنانچہ شیشی کھولی گئی۔ حسد کی ماری چپا نے تقریباً آدھا سینٹ اپنے اوپر انڈیل لیا۔ گوا تیزن نتھنے سکوڑتے ہوئے کہتی رہی۔ "اللہ ماری... کیسی منحوس خوشبو ہے۔" رستم نے اسے کوئی مشروب سمجھ کر پینے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ اس کے خیال میں خوشبو گواہی دے رہی تھی کہ اس مشروب کا ذائقہ بھی اچھا ہوگا۔

شو ختم ہونے کے بعد تانیا اسٹیج سے اتری تو جمال پھر اس کا منتظر تھا۔ "چائے پینے چلو گی نا؟" اس نے پوچھا۔

تانیا نے خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "نہیں... میں نہیں جا سکتی۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔"

"اوہ... تم اس کی فکر نہ کرو۔" جمال کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ "میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ ضرور آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میں... میں وعدہ نہیں کرتی۔" تانیا کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ لیکن وہ مقررہ وقت پر آڈیٹوریم کے دروازے پر پہنچ گئی۔

وہ اس تمام وقت میں خود کو یقین دلاتی رہی تھی کہ آذر مداخلت نہیں کرے گا

www.BooksPK.com

نرم اور مہربان رویے کی کشش اسے کھینچ رہی تھی۔ وہ وہاں پہنچی تو جمال کو اپنا منتظر پایا۔ اسی وقت ایک تاریک گوشے سے آذر برآمد ہوا اور ان دونوں کی طرف بڑھنے لگا۔

"خوب... بہت خوب" آذر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو تم دونوں کی کھال مسالہ مانگ رہی ہے۔ چلو یہی سہی" یہ کہہ کر اس نے تانیا کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ تانیا قریبی دیوار سے ٹکرائی اور چکراتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ "ذلیل عورت... میں اب تجھے زندگی کے آداب سکھا دوں گا۔" وہ غرّایا۔

جمال تیزی سے آذر کی طرف بڑھا۔ آذر نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ "اور تم جانباز احمق۔ میں ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں تم آئندہ اس کے قریب آنا بھول جاؤ گے۔"

لیکن یہاں آذر غلطی پر تھا۔ جمال نہ تو بزدل تھا اور نہ ہی کمزور تھا۔ اس کا جسم فولادی تھا اور کلائیاں جیسے اسٹیل کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ لڑنے کے فن سے بھی آشنا ثابت ہو رہا تھا۔ ان کا تصادم مختصر ثابت ہوا۔ وہ دونوں خاموشی سے دیوانہ وار لڑتے رہے۔ ان کے ہاتھ بہ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ صرف ان کے ہانپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک لڑائی ختم ہو گئی۔

آذر گوشت میں لپٹے ہوئے ہڈیوں کے ڈھیر کی طرح فرش پر پسر گیا۔ وہ خود سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون جاری تھا اور ایک آنکھ تقریباً بند ہو چکی تھی۔ جمال اس کے سر کے عین اوپر کھڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

تانیا دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر جما ہوا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر ڈھیر آذر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے اُسے اسی حال میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ اس منظر کے لیے اس نے خدا سے دعائیں کی تھیں لیکن اب جبکہ اس کی دعائیں رنگ لائی تھیں، وہ خوش نہیں تھی۔ اس کا وجود کسی گہری اداسی سے بھر گیا تھا۔ حلق میں کوئی گرہ سی اٹک رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہت قریب ہیں۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ شدت سے کی جانے والی خواہشیں پوری ہوں تو وجود کو اس قدر خالی خالی کر دیتی ہوں گی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ نفرت کے ہدف کو جسمانی طور پر کچلا ہوا دیکھ کر آدمی رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

جمال نے آگے بڑھ کر آذر کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور بولا۔

"مزید پٹنا چاہتے ہو؟"

آذر کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں شدید نفرت جھلکی۔ تاہم وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ بڑبڑایا لیکن اس کا کہا ہوا کوئی لفظ سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"چلو تانیا" آذر نے تانیا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آئندہ یہ تمہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ میں لاتوں کے بھوتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل دیے۔ تانیا نے ایک بار بھی پلٹ کر آذر کی طرف نہیں دیکھا۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر وہ پہلے کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح کھو گئے کہ انہیں کسی اور بات کا ہوش نہیں رہا۔ تانیا کے ذہن پر چھائے ہوئے اداسی کے بادل جمال کی دل آویز قربت کی وجہ سے چھٹ گئے۔ وہ تر و تازہ ہو گئی۔ اس رات بھی وہ ریسٹورنٹ بند ہونے کے وقت اٹھے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوٹل کی طرف چل دیے۔ سناٹے اور نیم تاریکی کا امتزاج ان دونوں ہی کو بے حد رومان پرور محسوس ہو رہا تھا۔

***

اگلے روز کھیل کے آغاز میں ہیرو اسٹال کے اسٹیج پر نمودار ہوا تو اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس پر نیل بھی تھا۔ اس کے تمام ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا کہ اس آفت کی وجہِ نزول کیا ہے۔ ہیرو نے جواب دیا کہ وہ اندھیرے میں دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔ اس پر سب نے چبھتے ہوئے سوال کیے۔ چالباز ہیرو کا مضحکہ اڑاتا رہا۔ اسے جھوٹا قرار دیتا رہا لیکن ہیرو اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ بوا تیز زن نے ہیرو کی آنکھ پر ٹکور کی۔ اس روز پُتلی تماشے کا موضوع ہیرو کی آنکھ ہی رہا۔ اس تمام عرصے میں تانیا اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی، جو نہ جانے کیوں بری طرح آنکھوں میں امڈے آ رہے تھے۔

تاہم اسٹیج سے اُتر کر ڈریسنگ روم کی طرف لوٹتے ہوئے جمال نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت آمیز انداز میں دبایا تو وہ جذبۂ تشکر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"آج ہم کلب چلیں گے... اور رقص کریں گے۔" جمال نے سرگوشی میں کہا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات منیجر بھی آڈیٹوریم کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے خود کھڑے ہو کر دس کے لگ بھگ ایسے تماشائی گنے تھے، جو گزشتہ روز بھی پُتلی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مفلس خان کا گھرانہ ہر روز نیا کھیل پیش کرتا تھا۔ ورنہ عام طور پر پُتلی تماشے والے ایک ہی کھیل بار بار دکھاتے ہیں۔

معاہدے کا عرصہ ختم ہو رہا تھا... اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ پُتلی تماشا وہاں کا مقبول ترین آئٹم ہے۔ چنانچہ آڈیٹوریم کی انتظامیہ نے آذر سے مزید ایک ماہ کے لیے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پُتلی تماشے کے علاوہ دوسرے تمام آئٹم تبدیل ہو رہے تھے... اور ان میں بازی گروں کا وہ طائفہ بھی شامل تھا، جمال جس کا رکن تھا۔

معاہدہ ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے جمال اور تانیا ریسٹورنٹ میں اپنی مخصوص میز پر موجود تھے کہ اچانک جمال نے تانیا سے پوچھا۔ "مجھ سے شادی کرو گی؟"... اور تانیا نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اقرار میں سر ہلا دیا۔

"تم دیکھنا... میرا نیا ایکٹ، جس میں تم بھی شامل ہو گی، مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گا۔" جمال نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم بھی مشہور ہو جاؤ گی۔ پھر ہم ساری دنیا گھومیں گے۔"

تانیا کو جمال کے خلوص، نرمی اور مہربان رویے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس نے جمال کے ساتھ جتنا عرصہ گزارا تھا، وہ بے حد خوشگوار تھا۔ زندگی میں اتنی خوش وہ کبھی نہیں رہی تھی۔ ان کے تعلق میں عجیب طرح کی سادگی تھی اور وہ ہر ابہام سے پاک تھا۔ اس کے برعکس آذر سے اپنا تعلق اسے محض ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہوتا تھا۔ تانیا کو پوری شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ اس کی زندگی کے لیے یہی بہتر ہے کہ اب اس ڈراؤنے خواب کا خاتمہ ہو جائے۔ اپنے طور پر اسے یقین تھا کہ وہ بھی جمال سے محبت کرتی ہے۔ وہ نوجوان تھا... خوبرو تھا... اور مہربان تھا۔ کوئی لڑکی اس سے زیادہ اور کیا آرزو کر سکتی ہے۔

اس کے باوجود وہ آخری ہفتہ تانیا کے لیے بے حد صبر آزما تھا۔ اگرچہ جمال کے ہاتھوں مرمت کے بعد آذر کبھی اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوا تھا لیکن اس کے مزاج کی تلخی اور تندی میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اس کی زبان اندر کا زہر اگلنے والی پچکاری کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ ریہرسل کے موقعوں پر آڈیٹوریم کے ملازمین کے سامنے بُری طرح لتاڑتا اور [illegible] پُتلیوں کی حرکات کی پُراسراریت بھی بڑھ گئی تھی۔ بعض اوقات پورے پورے دن اُس کی صورت نظر نہ آتی۔ کبھی وہ پورے پورے دن اپنی زہریلی زبان سمیت اس کے سر پر مسلط رہتا۔ جب وہ غائب ہوتا تو مسلسل پردے کے پیچھے بیٹھا رہتا۔ چوکیدار قسمیں کھا کر بتاتا تھا کہ اس نے آدھی رات کے بعد پُتلیوں کی آوازیں سُنی ہیں... تند اور سخت لہجے، جیسے وہ کسی موضوع پر بحث کر رہی ہوں لیکن اسٹال کا اسٹیج خالی تھا۔ شاید وہ پُتلیوں کی ذاتی گفتگو تھی۔

آذر نے تانیا کے شادی کے ارادے اور پُتلی تماشے سے علیحدگی کی خبر بڑے سکون سے سُنی... اور یہ بات حیرت انگیز تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بات کی توقع کر رہا تھا۔ یہ خبر سُنانے کے لیے جمال بھی تانیا کے ساتھ ہی گیا تھا۔ تانیا میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ تنہا اُس کا سامنا کرتی۔

آذر نے تانیا کا فیصلہ خاموشی سے سُنا... اور بے پروائی کے انداز میں کندھے جھٹک کر پلٹا اور ڈریسنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد آڈیٹوریم میں تانیا کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دانستہ تانیا سے اجتناب برت رہا تھا۔

www.BooksPK.com

آذر نے تو تانیا کا فیصلہ بخوشی قبول کر لیا تھا لیکن ساتوں پتلیوں کے لیے اب اس کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں رہا تھا۔ ہر ہفتہ تماشے کے دوران کھیل کا موضوع یہی رہتا۔ چنانچہ کھیل اب کھیل بالکل نہیں رہا تھا... بلکہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ تماشائیوں کا اپنا نکتۂ نظر بھی یہی تھا۔

تانیا کے اس رومانس اور شادی کے فیصلے پر ہر پتلی کا ردِعمل اس کے اپنے مزاج اور کردار کے عین مطابق تھا۔ بوا تمیزن کی نصیحتیں بامِ عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ تانیا کو زندگی کے متعلق اپنے تجربات کے حوالے سے بتاتی رہتی اور تماشائی بڑی دلچسپی اور سنجیدگی سے سنتے رہتے۔ بوا تمیزن کے لیکچر سے ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

پتلیاں تانیا سے طرح طرح کے سوالات کرتیں۔ مستقبل کے بارے میں اس کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کہاں جائے گی؟ کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ شادی کہاں ہوگی؟ چمپا پوچھتی کہ زیورات اور کپڑے کیسے ہوں گے۔ میک اپ باکس بھی خرید لیا ہے یا نہیں۔ پروفیسر عقلمند شادی کے حوالے سے نسلِ انسانی کے ارتقا کی اہمیت اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتا۔ وراثت کی سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے بتاتا کہ اولاد میں والدین کے اثرات کیوں نمایاں ہوتے ہیں...... بازی گروں کی اولاد میں کرتب دکھانے اور شاعروں کی اولاد میں شعر کہنے کی فطری صلاحیت کیوں ہوتی ہے۔ چالباز نے تانیا کو پیش کش کی کہ شادی کے موقع پر کھانے کی ذمے داری اسے سونپ دی جائے۔ رستم کا کہنا تھا کہ وہ بچوں کو گھمانے اور ہنسانے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے... اور اس سلسلے میں اس کی خدمات تانیا اور اس کے ہونے والے بچوں کے لیے حاضر ہیں۔ یہ سن کر تانیا تو سرخ ہو گئی جب کہ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس معصوم اور مسرت آمیز تجسس کے باوجود تماشائی یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ تمام پتلیاں تانیا کی جدائی کے تصور سے دل گرفتہ اور نڈھال ہیں... لیکن اسے چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تماشائیوں کو بھی ان پر بے ساختہ پیار آنے لگا تھا۔ تمام پتلیاں معصوم بچوں کی طرح عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو رہی تھیں، جیسے تانیا ان کے لیے تحفظ کی علامت رہی ہو۔

ہر آنے والے شو میں پتلیوں کا یہ دبا ہوا خوف نمایاں ہوتا گیا۔ ان کے انداز میں نہ چھوڑ کے جانے کی ایسی التجا اور پکار شامل ہوتی گئی جو تانیا کے دل کو چھید رہی تھی۔ وہ اپنا کردار ادا کرتے اور اسٹیج کے ایک گوشے میں ہو کر تانیا کو بڑی بے بسی، محبت، ملتجی نگاہوں سے تکتے رہتے۔ تانیا یہ سوچ کر الجھتی رہتی کہ وہ اپنے ان ننھے منے ساتھیوں سے بچھڑ کر کیسے خوش رہ سکے گی۔ وہ پتلیاں چند لمحے یاس آمیز نگاہوں سے تانیا کو تکتی رہتیں... اور پھر آہ سرد بھر کر غوطہ لگا جاتیں۔ آہستہ آہستہ یہ دباؤ تانیا کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر لرزتی رہتی کہ جدائی کے دن اُن کا کیا حشر ہوگا۔ اس سلسلے میں تو جمال بھی اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

تانیا کی شادی کے اعلان کے بعد تماشے کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ تماشائی تانیا کی شادی میں یوں دلچسپی لے رہے تھے، جیسے وہ انہی کی کوئی بہن یا بیٹی ہو۔ قدرتی طور پر وہ تانیا کے حوالے سے جمال سے بھی تعلق محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اب بازی گروں کے شو میں بھی رش ہونے لگا تھا۔ بالخصوص جمال کو بہت زیادہ داد دی جاتی تھی۔ جمال مفت کی اس پبلسٹی سے بہت خوش تھا۔ تانیا کی وجہ سے وہ محبت کی ایک جیتی جاگتی داستان کا ہیرو بن گیا تھا۔ شبلات اس کے اور تانیا کے تذکرے سے بھرے ہوتے تھے۔ بچہ بچہ اُن دونوں کے نام سے آشنا ہو گیا تھا لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اندازہ نہ ہوا کہ تانیا پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔

ہفتہ، ۱۵ دسمبر کی رات تانیا کا آخری شو ہوا، جو تانیا کے لیے ناقابلِ فراموش ثابت ہوا۔ اس شو کے ٹکٹ ایک ہفتہ پہلے ہی بک چکے تھے۔ وہ شو دیکھنے کے لیے دوسرے قریبی شہروں سے بھی تماشائی آئے ہوئے تھے۔ ہال میں موجود آدھے سے زیادہ تماشائی وہ تھے، جنہوں نے اب تک تانیا اور سات کٹھ پتلیوں کا کوئی شو نہیں چھوڑا تھا... جو تانیا اور اس کی سات سہیلیوں کی محبت میں پہلی نظر میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اگلی نشستوں کے ٹکٹ [illegible] خریدے گئے تھے۔ [illegible] لوگ ایسے تھے جنہیں [illegible] پس منظر میں ایک اور کہانی کی موجودگی نے سحر زدہ کیا تھا۔ پس منظر کی اس کہانی میں محبت بھی تھی... ہجر کے امکان سے تڑپتے ہوئے پتلیوں کے بدن بھی تھے... اور دلوں کے ٹوٹنے کی صدائیں بھی۔

”کتنی عجیب بات ہے ڈیئر!“ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”لڑکی کٹھ پتلیوں سے یوں باتیں کرتی ہے، جیسے وہ جیتی جاگتی ہستی ہوں۔ حالانکہ پس منظر میں یقیناً کوئی شاطر آدمی ہوگا... جسے اب تک ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ پسِ پردہ موجود وہ شخص تانیا سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے لیکن تانیا اس بازی گر سے شادی کر رہی ہے...“

ہال میں موجود ہر شخص اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔ پہلی بار وہ سب آذر کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

پروگرام سہانی دھن سے شروع ہوا۔ پھر اسٹال کے اسٹیج کا پردہ اٹھا تو دیہات کا چھوٹا سا سیٹ تماشائیوں کے سامنے تھا۔ گولو اپنے ماؤتھ آرگن سمیت نمودار ہوا... اور اُس نے اس پر ایک لوک گیت سنایا۔ پھر اچانک اسپاٹ لائٹس مدھم ہو گئیں۔ مدھم سی روشنی میں

تو اسٹیج پر ایک کٹھ پتلی نظر آئی... چالباز۔ چالباز نے بڑی محتاط نگاہوں سے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا۔ پھر اس نے سرگوشی میں پکارا۔ ”شش... اے گولو!“ گولو اس کے قریب آیا تو اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ”یہ تانیا کہاں ہے؟“

”مجھے علم نہیں۔ کہو تو ڈھونڈ کر لاؤں؟“ گولو نے جواب دیا۔

”جلدی سے لاؤ اسے۔ میں اسے کچھ دینا چاہتا ہوں۔“ چالباز نے کہا اور اسٹیج کے نیچے غوطہ لگا گیا۔ وہ دوبارہ اُبھرا تو اس کے ہاتھ میں ایک بے حد خوبصورت کامدار سرخ دوپٹا تھا۔ اس نے دوپٹے کو کاؤنٹر پر پھیلایا اور بڑی محبت سے اسے سہلاتے ہوئے گولو سے مخاطب ہوا۔ ”یہ میں نے تانیا کے لیے خریدا ہے۔“

”واہ، بہت اچھا ہے۔“ گولو نے بے ساختہ کہا۔ ”لیکن یہ تو بہت مہنگا معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی تانیا کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔“

گولو ایک طرف چلا گیا۔ چالباز بدستور دوپٹے کو سہلاتا رہا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ اپنے ہاتھوں کے لمس سے دوپٹے کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”اب تو ہی تانیا کی آبرو کا محافظ ہے... اپنا رنگ کبھی مت اڑنے دینا... اپنے کسی ستارے کو کبھی ٹوٹنے نہ دینا۔“

اسی وقت تالیوں کی زبردست گونج میں تانیا نمودار ہوئی۔ تالیاں کئی منٹ تک مسلسل بجتی رہیں۔ شاید وہ دوا ع ہوتی ہوئی دلہن کا استقبال تھا۔ تانیا کا گلا رندھ گیا۔ مہربانی اور ستائش اب بھی اس کے لیے اجنبی چیزیں تھیں... اور جب بھی اس کا سامنا مہربانی سے ہوتا... یا [illegible] تو اس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی۔ بالآخر اُس نے خود کو سنبھالا۔ ”اے چالباز... گولو کہہ رہا تھا کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ہاں تانیا... اور مجھے خوشی ہے کہ تم باقی لوگوں سے پہلے یہاں آ گئیں۔ وہ... بات یہ ہے کہ م... م...“ چالباز سے جملہ پورا نہ کیا گیا۔ اُس نے دوپٹہ اپنے منہ میں دبا کر تانیا کی طرف بڑھایا۔ ”یہ میری طرف سے تمہاری... شادی کا... تحفہ ہے... اسے میری الوداعی نشانی سمجھ لو۔“ لومڑ کی آواز بھرا گئی۔

تانیا کا ہاتھ تیزی سے اپنے دل کی طرف بڑھا۔ ”بہت خوبصورت ہے... لیکن... لیکن چالباز... اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بہت مہنگا ہے... اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس زیادہ پیسے...“

چالباز کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہرا گئی۔

تانیا نے اُسے بغور دیکھا... اور یک لخت چوکنا نظر آنے لگی۔ ”وہ... اس میں بھی کوئی چکر ہے یہاں آؤ... اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں اتنا قیمتی دوپٹہ کہاں سے ملا؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

چالباز نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ ”کیا یہ ضروری ہے تانی؟“

”تم خوب جانتے ہو۔ میں نے ہزاروں بار تمہیں دیانت داری کی اہمیت کے متعلق سمجھایا ہے...“

چالباز نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر تانیا کو زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔ ”اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو میں نہیں چھپاؤں گا۔“ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”میں نے یہ دوپٹہ قسطوں پر خریدا ہے۔ اب تو تم خوش ہو نا؟“

”ٹھیک ہے... لیکن باقی قسطوں کا کیا ہوگا؟ اگر تم کسی مہینے ادائیگی نہ کر سکے تو پھر وہ لوگ میرے گھر آئیں گے اور مجھ سے یہ دوپٹہ چھین لیں گے۔“

”کس کی مجال ہے اتنی۔“ چالباز بپھر گیا۔ لیکن فوراً ہی نرم لہجے میں بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں نے پکا معاہدہ کیا ہے۔ تم پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔“

اس وقت تک تانیا اس ایکٹ میں پوری طرح ڈوب چکی تھی۔ اب وہ اس کے لیے پتلی تماشا نہیں رہا تھا۔ ”کیسا معاہدہ؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ... وہ... بات یہ ہے کہ...“ چالباز بُری طرح گڑبڑا گیا لیکن تانیا نے آنکھیں نکال کر اُسے دیکھا تو جلدی سے بولا۔ ”اگر میں کبھی مقررہ وقت پر قسط کی ادائیگی نہ کر سکا تو انہیں حق ہوگا کہ مجھے [illegible] انکار کر دو لایت ایکسپورٹ کر دیں، جہاں اس سے کسی میم صاحب کے لیے کوٹ اور اسکارف تیار کیا جائے گا۔ میں نے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔“

ایسا لگا، جیسے تانیا کے دل میں کوئی پھانس دور تک اتر گئی ہو۔ ”اوہ... پیارے چالباز... یہ تم نے کیا کیا؟ اتنی بڑی قربانی [illegible]“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چالباز نے دوپٹہ گھونگھٹ کی طرح اس کے سر پر ڈال دیا۔ ہر طرف دوپٹے میں جڑے ہوئے تاروں کی ضو بکھر گئی۔ تانیا نے محبت آمیز [illegible] چالباز کا ہاتھ تھا... اور چالباز نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ انداز کسی ایسے شریر بچے کا سا تھا جو کسی بزرگ کی شفقت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہو۔

اس وقت تانیا کے سینے میں موج در موج گداز لہریں [illegible] رہا تھا۔ ایک عیار اور شریر لومڑ... اور اس قدر محبت! دنیا میں کوئی بھی شخص اس سے زیادہ کیا طلب کر سکتا ہے۔ صرف اُسے خوش [illegible] ... خوش رکھنے کے لیے وہ اپنی فطرت تک سے لڑ رہا تھا۔ یہ معجزہ صرف محبت ہی تو دکھا سکتی ہے۔

چالباز کے بعد یکے بعد دیگرے دوسری پتلیاں اسٹیج [illegible]

www.BooksPk.com

نمودار ہوئیں۔ انہوں نے بھی تانیا کو خوشیاں دیں... لیکن میٹھے میٹھے ڈنک کے کانٹے بھی چبھوئے۔ وہ سب اُس کے لیے شادی کے تحفے لائی تھیں... اپنی اپنی بساط سے بڑھ کر۔ تانیا اُن کے خلوص میں بھیگ بھیگ گئی۔ وہ جدائی کی رات تھی۔

پروفیسر عقل مند اس کے لیے بے بی انسائیکلوپیڈیا لایا تھا۔ "جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ اس میں موجود ہے۔" اس نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور جو کچھ میں نہیں جانتا، وہ بھی اس میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ میرا نعم البدل ہی نہیں، مجھ سے بہتر ثابت ہوگی۔ مجھے امید ہے، تمہیں کبھی میری کمی محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن میری دُعا ہے کہ تم کبھی کبھی مجھے یاد کرتی رہو۔"

چمپا نے تانیا کو ساڑھی پیش کی اور بڑی نیم دلی سے اس کی پیشانی کو چوما۔ کوآئیزن نے پریشر ککر دیا۔ اور مشفقانہ لہجے میں بولی۔ "یہ یاد رکھنا میری تانی کہ مردوں کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ خوش ذائقہ کھانے پکاؤ اور اپنے شوہر کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لو۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ بیشتر مرد درندے ہوتے ہیں۔ انہیں سدھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔" اس کے بعد اس نے تانیا کو کچھ قیمتی مشورے بلامعاوضہ پیش کیے۔

رانگی نے اسے ایک ایسا بیٹ پیش کیا، جو ایک تختہ کھسکانے سے ایک خوبصورت گڑیا میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ "یہ تمہارے پہلے بچے کے لیے ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ "اگر لڑکا ہو تو اس بیٹ سے کرکٹ کھیلے گا... اور اگر لڑکی ہوئی تو اس گڑیا سے کھیلے گی... اس کی شادی کرے گی!"

پھر گولو ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ہال میں موجود ہر شخص کی نظریں کریہہ المنظر یک چشم گولو پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اسپاٹ لائٹ کی روشنی میں گولو کے چہرے کے تمام عضلات شدتِ جذبات سے مرتعش نظر آ رہے تھے۔ اس نے تانیا کی طرف ایک چھوٹی سی پتلی کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تانی... میری بچی، میں غریب آدمی ہوں تجھے محبت کے گیتوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں دے سکتا۔ یہ کتاب تجھے ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ دُنیا میں محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، جس نے محبت کھوئی، اس نے سب کچھ کھو دیا... خود کو بھی کھو دیا۔"

تانیا کا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے اب تک اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ اس میں گولو کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے گھبرا کر اسٹیج کے پہلو کی طرف دیکھا، جہاں بازی گروں اور رقاصاؤں کے حلقے کھڑے پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ تماشائیوں کی طرح اُن کا بھی یہ حال تھا کہ جیسے وہ انسان نہیں، پتھر کے بے حس و حرکت بُت ہوں۔ ان میں جمال بھی تھا۔ کسرتی جسم والا دراز قامت نوجوان... لیکن اس لمحے وہ تانیا کو بہت اجنبی

لگا۔ اسے ایسا لگا، جیسے وہ جمال کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص کا چہرہ بے تاثر تھا۔ صرف جمال ایسا تھا، جس کے چہرے پر مسرت کا بھرپور تاثر تھا... اور اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پتلی تماشا نہیں دیکھ رہا ہے۔ بلکہ انجانی دُنیاؤں کے خوابوں میں گم ہے۔

پھر اسٹیج پر ہیرو نمودار ہوا۔ وہ بہت تھکا تھکا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے... اور وہ خود کو مطمئن اور خوش و خرم ظاہر کرنے کے لیے سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش ٹول کر سیٹی بجاتے بجاتے اچانک وہ بے سُرا ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے وہ کوشش ترک کر دی اور بولا۔ "کیا فائدہ خود کو اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کا۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں تانیا۔"

"الوداع ہیرو ڈیئر۔" تانیا نے اُداس لہجے میں کہا۔ "تم میری کمی محسوس کرو گی؟"

"ہاں ہیرو... تمام زندگی محسوس کروں گی۔"

"اور تمہارے بچے بھی ہوں گے؟"

تانیا کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "ہاں۔" اُس نے آہستہ سے شرمیلے لہجے میں کہا۔

"کیا وہ ہم جیسے ہوں گے؟"

"کاش... کاش... ایسا ہی ہو... کاش... یہ بات میرے اختیار میں ہوتی۔"

ہیرو چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ "میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں لایا تانی... لا بھی نہیں سکتا۔ میں تمہیں وہ محبت دوں گا، جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی... تمہاری پاسبانی کرے گی تانیا ہیں۔"

تانیا کا گلا رُندھ گیا۔ آنسوؤں پر قابو پانا اور دشوار ہو گیا تھا۔ "ہیرو... کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟" اُس نے پوچھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ اتنے طویل عرصے کے دوران ہیرو نے ایک بار بھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ہیرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس وقت سے کرتا ہوں، جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ خیر... اب تو بہت دیر ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نہ جانے کیوں محبت کے اظہار سے ڈرتا ہوں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ، تم جاتے جاتے مجھے کوئی تحفہ دے سکتی ہو؟"

"یقیناً... جو تم کہو... بشرطیکہ میری بساط میں ہو۔" تانیا کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

"میرے ساتھ ایک گانا گاؤ۔"

"ضرور گاؤں گی... لیکن کون سا گانا؟"

"یہ تو تمہیں گولو بتائے گا۔"

گولو آگے بڑھا... اور اس نے ماؤتھ آرگن پر ایک جانی پہچانی دھن چھیڑی۔

"اسے پہچانتی ہو نا، یہ محبت کا گیت ہے۔" ہیرو نے آہستہ سے کہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تانیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کی آواز ہال میں گونجنے لگی۔ "... اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دُکھ نہ کسی کو دیا کرو..." وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گاتے رہے... "شیشہ ٹوٹ کے جُڑ سکتا ہے، دل نہ جُڑے گر ٹوٹے۔ کتنا ہے بے درد وہ انسان، پیار کا گھر جو لوٹے۔ کام نہ ایسا کیا کرو، دُکھ نہ کسی کو دیا کرو..."

گیت ختم ہوتے ہی گولو ایک طرف چلا گیا۔ ہیرو نے جھک کر محبت سے تانیا کا رخسار چوم لیا اور بولا۔ "تمہارے گھر کے آنگن میں تمہارے اپنے حسین پھول کھلیں، تو بھی ہمیں بھول نہ جانا۔ بلکہ انہیں دیکھ کر ہمیں یاد رکھنا..." پھر اس نے بڑی دل سوز آواز میں ایک مشہور نغمے کا ٹکڑا گنگنایا۔ "مجھے دل سے نہ بھلانا۔" اور غوطہ لگا کر اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

فوراً ہی باقی پتلیاں دو، دو کی ٹکڑیوں کی شکل میں آئیں اور گاتی رہیں... "ہمیں دل سے نہ بھلانا، چاہے روکے یہ زمانہ، تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں..." یہ گیت ختم ہونے کے بعد تمام کٹھ پتلیوں نے تانیا کو محبت بھرے بوسوں میں بھگو دیا۔

اس [illegible] کے سامنے حجاب حائل ہو چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔ وہ بانہیں پھیلا کر رُندھی ہوئی آواز میں چیخی۔ "نہیں میرے پیارو، نہیں... میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے بچوں کی طرح پیار کروں گی...!"

اسے پتا بھی نہ چلا کہ شو ختم ہو چکا ہے... پردہ گر چکا ہے۔ اس نے تو وہ تالیاں بھی نہیں سُنیں، جن میں تماشائیوں کی محبت تھی... احترام تھا... اور جنہوں نے آڈیٹوریم کے درودیوار ہلا دیے تھے۔ اس نے جو آخری منظر دیکھا، وہ یہ تھا کہ چالباز چیتھو ممی آسمان کی طرف اُٹھائے دردناک آواز میں رو رہا تھا۔ رستم نے اپنا چہرہ اسٹیج کے پردوں میں چھپا لیا تھا... لیکن اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

تانیا اسٹیج سے اندھا دھند بھاگی... اور اس نے اپنے ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ دروازے سے پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دروازے پر نہ جانے کتنے لوگوں نے دستکیں دیں، اُسے پکارا... لیکن اُس

ایک کافر نے کہا ہے۔ "اگر گرانی اسی طرح بڑھتی رہی تو میں آئندہ جنم میں پیدا ہونے کو تیار نہیں ہوں۔"
میں نے کہا۔ "میاں، تم گرانی کی شکایت کرتے ہو حالاں کہ ڈالر، اسٹرلنگ، مارک، دینار، ریال، ین سب سستے ہوتے جا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ سستا اپنا پاکستانی روپیا ہو گیا ہے، اسی لیے ہر شخص کو زندگی عزیز ہو گئی ہے۔ مجھے جنت اسی لیے عزیز ہے کہ وہاں کوئی منگائی نہیں، کوئی بجٹ نہیں، کوئی پولیس نہیں، کوئی رشوت نہیں۔"

یہ جھرنے عمر بھر خشک نہیں ہوں گے۔

پھر جمال آیا۔ وہ اس سے دروازہ کھولنے کی التجائیں کرتا رہا۔ "اس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" تانیا نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "صبح میں تمہیں ہوٹل کے دروازے پر ملوں گی۔" جمال نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ڈریسنگ روم میں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

وہ تاریک ڈریسنگ روم میں بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ اس نے روشنی کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

☆☆☆

دُنیا بھر میں ہر اسٹیج شو ختم ہونے کے بعد رات کے وقت بے حد ویران اور سنسان مقام ہوتا ہے۔ سعید آڈیٹوریم کے اسٹیج پر صرف زیرو کا ایک بلب روشن تھا۔ اس کا مقصد شاید صرف تاریکی کا احساس دلانا تھا۔ اسٹیج پر سیٹس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ عقبی دیوار کے پاس وہ شالی موجود تھا، جس کی پیشانی پر مغلِ علی اور اہلِ خانہ تحریر تھا۔

اسٹیج پر پھیلے ہوئے طویل سایوں کے درمیان گولو بیٹھا تھا۔ وہ بے حد سوگوار تھا۔ برسوں پہلے وہ تکلیف اور اذیت کے ہر احساس سے عاری ہو چکا تھا۔ اس لیے آج کا دُکھ اسے پہاڑ سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ دُکھ محسوس کرنے کا عادی نہیں رہا تھا۔ اس وقت چار بجے تھے۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا... لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔

تانیا اپنے ڈریسنگ روم سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں وہی ٹیلا نا بیگ تھا، جسے لے کر عرصہ پہلے وہ خود کو غرقِ سمندر کرنے کی نیت سے نکلی تھی... اور خدا نے ازراہِ مہربانی موت کے

www.BooksPK.com

سے ہٹ کر صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح دل شکستہ تو نہیں تھی۔۔۔ اس کے علاوہ اس بار اس بیگ میں پہلے سے زیادہ اور کہیں بہتر چیزیں موجود تھیں۔ دکھی وہ اب بھی تھی، لیکن دکھ کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ اپنے پیچھے اُس تانیا کا ایک حصہ چھوڑے جا رہی ہے، جو وہ تھی۔۔۔ اور جو وہ آئندہ نہیں ہو گی۔

دروازے تک پہنچنے کے لیے اسٹیج سے گزرنا ضروری تھا۔ اُس نے پہلو کی جانب سے اسٹیج پر قدم رکھا، جہاں بہت مدھم روشنی تاریکی سے لڑنے کے بعد نزع کے عالم سے دوچار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑھتی رہی۔ پھر اچانک اس تاریکی میں سے ایک سخت اور بھاری ہاتھ نکلا، جس نے اُس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا ہاتھ سختی سے اُس کے منہ پر جم گیا۔ اسے چیخنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اُسے ایسا لگا، جیسے خوف کے مارے اُس کے دل نے دھڑکنا موقوف کر دیا ہے۔ اگر وہ ہاتھ ذرا کھردرا ہوتا تو شاید اُس کا دل واقعی بند ہو چکا ہوتا لیکن اس کی اندھیرے سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی بصارت نے صرف ایک آنکھ کی چمک محسوس کی۔۔۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اُسے گرفت میں لینے والا کون ہے۔

”خدا کے لیے، گڑیا۔۔۔ میری بچی، اپنی آواز نہ نکلنے دینا۔“ اس کے کانوں میں گولو کی سرگوشی گونجی۔

اس سناٹے میں تانیا کو اپنے دل کے دھڑکنے کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گولو نے اُس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ ”کیا بات ہے گولو؟“ اُس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ تم یہیں رُک جاؤ میرے پاس۔۔۔ لیکن آواز نہ نکلے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

تانیا کو گولو کے جسم کی لرزش واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ”لیکن گولو۔۔۔ ڈرنے کی کوئی وجہ بھی۔۔۔“

”شش تانی۔۔۔ بولو مت۔ صرف سنو۔“ گولو نے کہا اور نرمی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ابتدا میں ان کی اپنی سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر کچھ گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ کچھ دیر بعد بصارت بھی سماعت کے ساتھ شامل ہو گئی۔ گولو نے اشارے کے طور پر تانیا کے ہاتھ پر خفیف سا دباؤ ڈالا۔ ہیرو کا ہیولا اسٹال کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔۔۔ اور اُس نے محتاط نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اُس کا وہ انداز بے حد خوفناک تھا۔ وہ احتیاط ناقابلِ فہم بھی تھی کیونکہ اس وقت وہاں کسی کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ انداز اداکاری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اداکاری تو تماشائیوں کے سامنے کی جاتی ہے۔ خالی ہال میں اداکاری کا کیا کام؟

”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔“ گولو نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں ان کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔“

اس بار تانیا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خاموش رہو گولو۔“

ہیرو گرد و پیش کا جائزہ لے کر مطمئن ہو گیا اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے تو وہ اسٹال کے ایک گوشے کی طرف چلا گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور چند منٹ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ پھر ایک سرگوشی نے جیسے خاموشی کے شیشے کو چکنا چور کر دیا۔ ”ہیرو۔۔۔ یہ تم ہی ہو نا؟“ کسی نے پوچھا۔ ہیرو نے سر اُٹھایا۔ ”ہاں۔۔۔ میں ہی ہوں۔“ اُس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

”میدان صاف ہے؟“

”ہاں۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔“

”چوکیدار کہاں ہے؟“

”سو چکا ہے۔“

اس جواب کے بعد لوفر کا سر اُبھرا۔ وہ بھی چند لمحے گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد وہ ہیرو کے پاس چلا گیا۔

”ہاں، اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ اُس نے پوچھا۔

”اگر اس سوال کا جواب تم نہیں دے سکتے تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔“ ہیرو نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم ہی سب سے زیادہ ذہین ہو۔ اس شو کو تم ہی۔۔۔ ساری خرابی تمہاری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔“

”میری؟“ ہیرو کے لہجے میں احتجاج تھا۔۔۔ لیکن فوراً ہی اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ”ممکن ہے لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تانیا اُس کرتب باز پر ریجھ جائے گی۔ وہ خود غرض آدمی تانیا کو کوئی خوشی نہیں دے سکے گا چالباز۔“

”تم نے اُسے سمجھایا کیوں نہیں؟“

”ہوا کیرین نے کوشش کی تھی۔۔۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تانیا بچی ہے۔ نہیں جانتی کہ جبال خود غرض آدمی ہے اور اُسے اپنی شہرت کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”تو ہیرو۔۔۔ کیا تانیا سچ مچ اُس سے شادی کر لے گی؟“ چالباز نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”بالکل کرے گی چالباز۔۔۔ ہماری دُنیا تو سمجھو کہ لُٹ چکی۔“

”مردود۔۔۔ ذلیل۔۔۔“ چالباز غرّایا۔

”نہیں چالباز، اپنی زبان خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ تمہیں معلوم ہے کہ تانیا بد کلامی کو کس قدر ناپسند کرتی ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ زندہ رہنے سے کوئی فائدہ ہے؟“

”کم از کم میرے نزدیک تو نہیں ہے۔“ چالباز نے جلدی سے کہا۔ ”میرے لیے تو تانیا ہی سب کچھ تھی۔ اب تو جینا بیکار ہے۔“

”میں تم سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے، ووٹنگ کر لی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم چیئرمین ہو۔۔۔ میں ذرا حاضری چیک کر لوں۔ ہاں بھئی رستم؟“

”میرا خیال ہے، میں یہاں موجود ہوں۔“ پیچھے سے دیوقامت رستم کی آواز آئی۔

”راگی؟“

”حاضر جناب۔“

”چمپا؟“

”میں موجود ہوں۔“

”بوا کیرین؟“

”ہاں بھئی۔“

”پروفیسر عقل مند؟“

”میں کبھی غیر حاضر رہا ہوں؟“

”سب موجود ہیں۔“ چالباز نے اعلان کیا اور پیٹ پر ہاتھ باندھ لیے۔

ہیرو نے بڑی سنجیدگی سے صدارتی تقریر شروع کی۔ ”خواتین و حضرات، ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری محبوب بہن تانیا شادی کی غرض سے ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔۔۔ اور اب ہمیں ووٹ کر لینے پڑیں گے۔ اس اجلاس کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے بچھڑ کر بھی ہم زندہ رہیں گے؟“

”جب کوئی ہمیں دیکھنے ہی نہیں آئے گا تو پھر ہمارے وجود کا کیا فائدہ؟“ راگی نے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

”جب وہ ہم میں نہیں رہی تو پھر بچا کیا؟“ چالباز نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ ممکن ہے، ہمیں اس جیسا کوئی اور مل جائے۔“ چمپا بولی۔

رستم نے کہا۔ ”میں بے وقوف اور کم عقل ہوں۔۔۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں تانیا جیسا کوئی اور نہیں مل سکتا۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔“

”لیکن تانیا کی آمد سے پہلے بھی ہم تماشا دکھاتے تھے۔“ بوا کیرین نے رائے زنی کی۔

”تو تم اپنی اوقات پر واپس جانا چاہتی ہو؟“ پروفیسر عقل مند نے اُس سے پوچھا۔ ”تباہ حالی کے وہ دن یاد ہیں۔ جنہیں کے بعد۔۔۔ کچھ اچھی نہیں لگتی۔“

”کچھ بھی ہو۔ کم از کم اپنی تقدیر پر شاکر رہنا ہو گا۔“ چمپا نے ۔۔۔ لہجے میں کہا۔

”میرے خیال میں تو ہمیں بلندی اور پستی سے بے نیاز ہو جانا چاہیے۔“ پروفیسر نے رائے دی۔

”وہ کیسے پروفیسر؟“ ہیرو نے پوچھا۔

”ترکِ وجود کے ذریعے۔“ پروفیسر نے مختصراً کہا۔

”اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ میں سمجھا۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حل قابلِ قبول ہے۔“ چالباز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تانیا سے بچھڑ کر جینا نہیں چاہتا۔“ رستم نے کہا۔

”اکثریت کا یہی خیال ہے دوست۔“ چالباز نے کہا، پھر ہیرو سے مخاطب ہو گیا۔ ”اب ووٹنگ ہو جانے جناب چیئرمین۔“

چند لمحے خاموشی رہی، پھر ہیرو نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تو گویا ہم سب ترکِ وجود کے حق میں ہیں؟“

”ہاں، کاکورس ۔۔۔ دیا۔ ان میں ایک باریک سی نحیف سی آواز بھی تھی۔ وہ چمپا تھی۔

”تحریک پاس ہو گئی مسٹر چیئرمین۔ اب اس پر عمل درآمد کیا جائے۔“ چالباز غرّایا۔

”یہ کس طریقے سے ہو گا۔۔۔؟“

”مجھے خودکشی ہمیشہ سے اپیل کرتی رہی ہے۔“ راگی نے کہا۔ ”ہندوؤں میں ستی کی رسم، جس میں بیوہ خود کو نذرِ آتش کر دیتی ہے۔“

”دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ لیکن آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔“ چالباز نے کہا۔

”اس کے لیے آڈیٹوریم کا پچھلا حصہ مناسب رہے گا۔“ ہیرو بولا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔“ چمپا نے چیخ کر کہا۔

چالباز نے تیزی سے غوطہ لگایا۔ چند لمحے بعد وہ اُبھرا تو اُس کے ہاتھوں میں چمپا کی گردن تھی۔ چمپا کی آنکھیں حلقوں سے گویا باہر نکل آئی تھیں۔ زبان بھی باہر نکلی ہوئی تھی۔ چالباز نے بڑی بے دردی سے چمپا کے بے جان جسم کو اسٹیج پر ڈال دیا۔۔۔۔۔۔ چمپا کے اسٹیج کے فرش پر گرنے کی ہلکی سی آواز بھی اس سناٹے میں دھماکے کی طرح گونجی۔

تانیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”بے چاری چمپا۔“ چالباز نے فرش پر بکھری ہوئی اس بے حس و حرکت چمپا کو دیکھا

www.BooksPK.com

اسے کوئی بتلند پوچھا۔ "کوئی اور اجاس فیصلے سے انحراف کرنا چاہے؟"
"وہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ بہت زیادہ اِتراتی تھی۔" ٹوائیرزن نے جیپا کے بارے میں کہا۔
"لیکن تھی بہت خوبصورت۔" رستم نے کہا۔
"دنیا کا سب سے بڑا فریب۔" ہیرو نے تبصرہ کیا۔ "سنہرے بالوں والی شہزادی...."
"سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔" چالباز نے منہ بنا کر کہا۔ اُس نے جیپا کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔
"کسی کے ساتھ نامہرباں کا کبھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔" پیچھے سے پروفیسر عقل مند کی آواز آئی۔ "وہ جیسی بھی تھی، اُسے خالق کُل، خدا تعالیٰ نے بنایا تھا جس نے ہمیں بنایا ہے اور دُنیا کی ہر چیز بناتی ہے۔"
"اور جب ہم نہیں رہیں گے تو خدا کی خدائی کا کیا بنے گا؟" رستم نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔
"ہم تو کسی اور خدا کی خدائی میں شامل ہیں۔" پروفیسر کا لہجہ تلخ تھا۔
"تب بھی... ہمارے خدا اور اُس کی خدائی کا کیا بنے گا؟" رستم نے اصرار کیا۔
"شاید ہمارا خدا بھی خود کو تباہ کرے گا... اپنی چھوٹی سی خدائی سمیت کیونکہ ہم سب تو اس کے مختلف رنگوں کا عکس ہیں۔ ہم نہ ہوں گے تو وہ اپنی پہچان... اپنا اظہار بھی کھو بیٹھے گا۔"
"لیکن کیوں؟" ہیرو نے پوچھا۔
"کیوں کہ خدا اپنی تخلیق کی ناکامی قبول نہیں کر سکتا۔"
"واہ... پروفیسر، تم واقعی عالم ہو۔ میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" چالباز نے پُرستائش لہجے میں کہا۔
"علم کیا، علم کی بساط ہی کیا۔ جیسی جس کے گمان میں آئی... اور گمان اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔" پروفیسر نے مفکرانہ انداز میں کہا۔
"خیر... تو بات صرف اتنی سی ہے کہ مغلس خان اور اہلِ خانہ اس دُنیا کو الوداع کہنے والے ہیں۔"
گوتو نے سر گھما کر تانیا کو دیکھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ فرطِ خوف سے پھیلی ہوئی تھی۔ "تانیا بی بی... یہ لوگ مرنے والے ہیں۔" اس کے لہجے میں دہشت تھی۔ "انہیں مرنے نہ دو میری بچی...."
اسٹیج پر چالباز ہیرو کی طرف بڑھا اور اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خدا حافظ دوست۔ تمہارے ساتھ یہ سفر بہت خوشگوار رہا... شکریہ۔"
ہیرو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "خدا حافظ چالباز۔ تم ہمیشہ اچھے دوست ثابت ہوئے۔ اب میں نیچے چلتا ہوں تاکہ کوچ کی مکمل تیاری...."
اُسی وقت تانیا اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے اُس کی ٹانگیں سُن ہو رہی تھیں۔ اُس نے گوتو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ ٹانگوں کا دورانِ خون بحال ہونے کے بعد اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور اسٹال کی طرف بڑھی۔ اسٹال سے کچھ فاصلے پر اُس نے اپنا بیگ اُچھال دیا تاکہ پتلیاں اُس کی آمد سے باخبر ہو جائیں۔
کتنی عجیب بات تھی، تانیا اور اُن پتلیوں کے درمیان زندگی اور موت کا تعلق تھا۔ تانیا کو وہ رات یاد آ گئی جب وہ اِن پتلیوں سے متعارف ہوئی تھی۔ یہ بھی ویسی ہی رات تھی۔ وہی مدھم روشنی... وہی طویل سائے... وہی پُراسرار اسٹال... فرق صرف اتنا تھا کہ اُس رات تانیا موت کو گلے لگانے کی غرض سے نکلی تھی اور پتلیوں نے مداخلت کی تھی... جب کہ آج رات تمام پتلیاں موت سے ہمکنار ہونا چاہتی تھیں اور تانیا کو انہیں بچانا تھا... حساب بے باق کرنا تھا۔
"ہیلو چالباز۔" تانیا نے اسٹیج پر موجود چالباز کو پکارا، جو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ بیگ پھینکنے کا دھماکا بھی اُس کے انہماک کو نہیں توڑ سکا تھا۔
چالباز اُس کی آواز سُن کر بُری طرح چونکا۔ اُس نے سر اُٹھا کر تانیا کو دیکھا۔ مدھم روشنی میں اُس کی آنکھوں میں [illegible]
"تانیا تم؟ تم یہاں کیسے؟ تم یہاں کیسے ہو؟" اُس نے [illegible] کر پوچھا۔
"ان سوالات کا کیا فائدہ؟ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں۔" تانیا نے کہا۔ "آگ میں گوشت جلانے اور ہڈیاں گلانے والے شعلوں کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ آخر میں صرف پچھتاوے کی راکھ بچے گی، جسے وقت کی تیز ہوا بکھیر دے گی۔ چالباز... تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔"
"ہمیں علم نہیں تھا کہ تم یہاں موجود ہو اور پھر ہم نے جمہوری طریقہ...."
"بس... جمہوریت کا نام نہ لو۔" تانیا نے بھڑک کر کہا۔ "تم نے لوگوں کے ساتھ زبردستی کی ہے۔"
"ناممکن ہے... کیوں کہ میں، ہیرو اور پروفیسر بہت جذباتی ہو رہے تھے۔" چالباز کے لہجے میں پشیمانی تھی۔ "لیکن یہ سب کچھ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ تم ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہو...."
"اور جیپا؟"
چالباز نے سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرے پر اعترافِ جُرم تحریر تھا۔ "وہ خوبصورت شمعیں بجھا دینا ہی بہتر ہوتا ہے... سو ہم نے اسے بجھا دیا۔"
"ہم نے؟"
"ہم نے نہیں، میں نے۔" چالباز کا لہجہ تُند ہو گیا۔ "وہ تم سے محبت نہیں کرتی تھی...."
"تمہیں اس کا حق کس نے دیا؟"
"میں جانتا ہوں، مجھے اس کا حق نہیں تھا لیکن یہ بُری نہیں ہے۔ صرف بے ہوش ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اجتماعی خودکشی کے موقع پر یہ مزاحمت کرے۔" چالباز نے سر جھکا کر کہا، پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "پلیز تانیا... ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔"
"چالباز... تمہاری فطرت کبھی نہیں بدلے گی۔" تانیا نے تہدیدی لہجے میں کہا... "لیکن انداز میں محبت بھی تھی۔ "تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو... محبت کے ذریعے... ہمیشہ کی طرح۔"
"تانی... یقین کرو، اس بار یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔ اگر تمہیں جانا ہی ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"
"اور دوسروں کو چھوڑ جاؤں! چالباز! تم کتنے خود غرض ہو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے وفائی کرو گے؟"
چالباز تانیا کے قریب آ گیا۔ "ضرور کروں گا۔ مجھے تمہارے سوا کسی کی پروا نہیں ہے تانی۔ مجھے ساتھ لے چلو... تم جانتی ہو کر [illegible]... اور میں [illegible] سے ہمیشہ محبت کرتا ہوں۔"
"[illegible] انسان کو جڑوں سے کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔" تانیا کو لمحاتی طور پر یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ پتلی گھرانے سے اپنا تعلق توڑ چکی ہے۔ اُسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ صبح طلوع ہو چکی ہے، جب اُسے ایک نئے اور خوشگوار سفر پر نکلنا ہے۔ اُس نے بڑی محبت سے چالباز کا سر تھپتھپایا اور بولی۔ "لیکن چالباز، یہ بے وفائی ہے... اور بے وفائی نہایت بُری چیز ہے۔"
چالباز نے اپنی تھوتھنی تانیا کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔ "تانیا بی بی... ایک سے وفا کے لیے ساری دُنیا سے بے وفائی کرنا پڑے تو ایسی بے وفائی کو کیا کہیں گے؟" اس نے آہ بھر کے کہا۔ "ویسے بھی... مجھے تو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ میں اچھا ہوں بھی نہیں۔ مجھ سے تو توقع ہی بے وفائی کی رکھی جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں بھی اسی میں خوش ہوں۔ اچھی توقعات انسان کے لیے بہت بڑی ذمے داری ثابت ہوتی ہیں۔ وہ ان پر پورا اترنے کے لیے بڑی اذیتیں اُٹھاتا ہے۔ میں نے تمہارے لیے... تمہیں خوش کرنے کے لیے اچھا بننے کی کوشش کی... لیکن چاول سے [illegible] جاسکتا ہے فطرت سے نہیں۔ البتہ تم ساتھ ہو تو یقیناً مجھے ٹوکتی رہو گی۔ اور میں پستیوں کی طرف پھسلنے سے محفوظ رہوں گا...."
محبت میں بھیگی ہوئی بے بس تانیا چالباز کے سر کو محبت سے سہلانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ "میرے پیارے چالباز...."
چالباز نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر خاموشی سے کہا۔ "پلیز تانی... مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا... میرا خیال رکھنا۔"
اُس کا لمس ہمیشہ تانیا کو نئے جہانوں کی سیر کرا دیتا تھا۔ اس کا سینہ محبت سے معمور ہو گیا۔ اس کے دل میں چالباز کے دُکھ درد لَو دے اُٹھے۔
اسی وقت رستم اسٹیج پر اُبھرا۔ "اوہ... معاف کرنا تانیا، شاید میں مخل ہوا ہوں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، پھر جیسے اُسے کسی خیال نے چونکا دیا۔ وہ اُچھل کر بولا۔ "اوہ۔ کیا تم واپس آگئی ہو۔ خدا کا شکر ہے۔ تم واپس آگئی ہو تو میں اب مرنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔"
"لعنت ہے۔ تم ہمیشہ غلط موقع پر آجاتے ہو۔" چالباز غرّایا۔
"لیکن رستم... میں کیسے ٹھہر سکتی ہوں۔ میری تو آج شادی ہونے والی ہے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم سوجاؤ۔ میں کیا کروں۔ اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے؟"
"مجھے اپنے ساتھ لے چلو تانیا۔ تم نہیں جانتیں کہ زرقلمت لیکن بے وقوف ہونے کے کتنے نقصانات ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ میرا کوئی خیال رکھنے والا نہیں... کوئی دوست نہیں، تمہارے سوا۔"
تانیا نے خود کو کہتے سُنا۔ "لیکن میں تو شادی کر رہی ہوں...." بالکل وہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اور بول رہا ہو... اور کسی اور کے بارے میں بول رہا ہو۔ اصل دُنیا کون سی تھی؟ وہ، جس میں وہ اس وقت موجود تھی... یا وہ، جہاں وہ جمال کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ رستم کے مسائل کے متعلق وہ کس قدر ہمدردانہ انداز میں سوچتی آئی ہے۔
"رستم... تم ہرگز بے وقوف نہیں ہو۔" تانیا نے احتجاج کیا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ تم بونوں کی دُنیا میں دیو کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہو۔ لوگ اپنے سے برتر کو کمتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔"
"واہ... کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے تم نے۔" نیچے سے راگی نے نعرہ لگایا۔ پھر وہ اوپر آ گیا۔ "یہی کچھ تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ بڑے بڑے موسیقار مجھ سے جلتے ہیں۔ اور ہاں تانیا... تمہاری واپسی میرے لیے باعثِ صد مسرت ہے... تمام تر خود غرضیوں کے ساتھ... کیوں کہ اب میں موت سے بچ جاؤں

www.BooksPK.com

گا۔ یہ کہہ کر وہ پھر پیچھے غوطہ لگا گیا۔

اسی وقت ہیرو ستی پرستی دھرتی کی دُھن بجاتا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے تانیا کو بدستور کھڑے دیکھا تو حیران نظر آنے لگا۔ "ارے تانیا... تم ابھی تک موجود ہو گئیں نہیں ہو؟"

"میں جا ہی رہی تھی ہیرو، ذرا یہاں آؤ۔"

ہیرو تانیا کی طرف بڑھا... لیکن انداز ایسا تھا جیسے کسی بھی لمحے بھاگ کھڑا ہو گا۔

"میں نے اتفاق سے سب کچھ سُن لیا تھا۔ ہیرو... جو کچھ ہوا، تمھیں اس پر شرمندگی نہیں ہے؟"

"اوہ" ہیرو نے بے ساختہ کہا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا "تمھارے بغیر ہم میں سے کوئی بھی ہوش مند نہیں تھا تانیا۔ شروع میں تو میں سمجھا تھا کہ تمھارے بغیر بھی میں نگر نگر گھوم کر لطف اندوز ہو سکوں گا لیکن بعد میں مجھ پر حقیقت کھل گئی۔ میں تم پر تکیہ کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تم ہمیشہ مجھے سہلاتی رہی ہو... نصیحتیں کرتی رہی ہو۔"

"اوہ ہیرو، نہیں۔ میں نے تو ہمیشہ یہی کوشش کی کہ تمھارے کاموں میں مداخلت نہ کروں۔"

"تمھیں شاید اس کا اندازہ بھی نہیں ہو گا۔ تم مجھے آگے بڑھنے کی... اُڑنے کی ترغیب دیتی رہی ہو۔"

تانیا کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلا گئیں "بے شک۔ تم اونچی چھلانگ لگا سکتے ہو۔ آسمان کے تمام ستارے تمھارے دامن میں بھر سکتے ہیں... اور... اور... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"لیکن میں اُڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے ستاروں کی آرزو بھی نہیں ہے۔" ہیرو نے چیخ کر کہا "میں تو صرف تمھارا ساتھ چاہتا ہوں تانیا، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔" اس نے اپنا سر تانیا کے سینے پر رکھ دیا۔

"ہیرو... پیارے ہیرو... میں تو پہلے ہی دن سے تمھیں پیار کرتی رہی ہوں۔" تانیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہیرو نے سر اُٹھا کر اُسے بغور دیکھا "نہیں... تم نے کبھی ہم سے محبت نہیں کی۔ ورنہ تم ہمیں چھوڑ کر جانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔"

اس جملے نے جیسے تانیا کا دل چھید ڈالا "میں تم سے محبت کرتی ہوں... تم سب سے محبت کرتی ہوں... پوری سچائی اور شدت کے ساتھ۔ لیکن مجھے اس سے نفرت ہے... اتنی شدید نفرت ہے کہ ہر محبت اس کے سامنے دب جاتی ہے۔ میں کیا کروں؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے آڈیٹوریم کی خالی

نشستوں کو دیکھا... سنسان اسٹیج کو دیکھا... پھر اُس نے وہ بات کہہ ڈالی جس کا اظہار وہ صرف ان کٹھ پتلیوں کے سامنے کر سکتی تھی۔ کسی انسان کے سامنے اس اظہار کی اس میں جرأت نہیں تھی "میں اس سے محبت کرتی تھی۔ میں پہلی ہی نظر میں اُس سے محبت کی گنہگار ہو بیٹھی تھی۔" اُس نے تھکے لہجے میں کہا "میں اُسے اپنانا چاہتی تھی کہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی... سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے میری محبت کے جواب میں تلخی اور شیطنت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں اس کے لیے راتوں کو جاگتی اور کڑھتی رہی۔ اُسے خوش کرنے کے انداز تراشتی رہی... میں نے اسے کیسے کیسے تحفے پیش کیے۔ لیکن اس کے رویے نے میری محبت کو نفرت میں بدل ڈالا۔ جیسے جیسے وہ نفرت بڑھتی گئی تمھارے لیے میری محبت بھی شدید ہوتی گئی۔ اتنی شدید محبت اور نفرت آخر کب تک ایک ساتھ قدم بہ قدم چل سکتی ہے۔ ہیرو... ایسے میں تو انسان ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے... پاگل ہو جائے۔ ہیرو... میرے ہیرو... مجھے جانے دو..." لیکن الفاظ کے برعکس ہیرو کے کندھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اور سخت... اور گداز ہو گئی تھی۔ پھر چالباز بھی اسی طرف چلا آیا۔ وہ بھی تانیا سے لپٹ گیا۔ ان معصوم کٹھ پتلیوں کے معصوم لمس نے تانیا کو یوں رلایا کہ اسے ایسا لگا، وہ آنسو بن کر بہہ جائے گی... اس کا دماغ چٹخ جائے گا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر اچانک اسے ہیرو کی باریک آواز نے چونکا دیا "لیکن تانیا... ہم... تمھارا... [illegible] ... ساتھی کون تھے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ یہی سوال چالباز نے پوچھا۔ اور جب تانیا نے آنکھیں کھولیں تو وہ دونوں اسٹیج سے جا چکے تھے۔ البتہ پروفیسر عقل مند وہاں موجود تھا۔ عینک کے عقب سے اس کی آنکھیں تانیا کو اپنے وجود میں اُترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اتنے عرصے کے تعلق میں پروفیسر کا قرب تانیا کے لیے سکون اور اطمینان کی علامت بن چکا تھا۔ وہ فلسفی تھا۔ ایسا دوست تھا جس پر انحصار کیا جا سکتا تھا۔ وہ مشیر تھا... اور ہمیشہ بحرانی وقت میں اسٹیج پر نمودار ہوتا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے کھلونوں اور دلوں کا مرہم تھا۔ چنانچہ تانیا ہمیشہ پُرسکون ہو گئی۔ لیکن وہ تو وہی سوال پوچھ رہا تھا۔

"پیاری تانیا... آخر ہم لوگ کون ہیں... ہیرو، چالباز، چھپا ہوا قبرستان، راگی اور میں خود۔ بتاؤ، ہم کون ہیں؟ ہمارا حوالہ کیا ہے؟"

تانیا کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا۔ اُسے ایسا لگا، جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ اس نے سہارے کے لیے لسشال کا کونا تھام لیا۔ گرد و پیش کی دیواریں گر رہی تھیں۔ وہ تمام دنیا کی حصار

فریب تھے، جن کے پیچھے اُس نے زندگی کی پناہ گاہیں تعمیر کی تھیں... جہاں تحفظ تھا... بے خبری اور خود فریبی تھی۔

واقعی، وہ لوگ کون تھے، کیا تھے؟ وہ کیسا جادو تھا جس نے انھیں الگ الگ رکھا تھا۔ ان ساتوں کو جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے، اپنی محبت اور نرمی کے باوجود... لیکن چالاک، شیطان صفت شخص سے منسوب تھے۔ اس جادو کے پیچھے کون تھا... کون تھا اس پردۂ زنگاری میں؟

"ذرا سوچو تو تانیا، وہ کس کا ہاتھ تھا جسے بڑی محبت سے تھام کر تم جھرلی کے آنسوؤں سے بھگوتی رہی تھیں... ہیرو کا تھا، چالباز کا تھا یا رستم کا تھا؟"

تانیا کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی "اوہ... وہ تو وہ ہاتھ تھا جو تھپڑ بن کر میرے منہ پر پڑا تھا اور انگلیوں کے نشان ثبت کر گیا تھا... شاید ان اذیتوں کی یاد میں ہی اُٹھا تھا تو اس نے تھیں، لیکن جن کے لیے آنسو میں نے بہائے تھے۔"

"ہاں تانیا... اور تمھیں اس ہاتھ سے محبت تھی۔ اس ہاتھ نے تمھیں سہلا دیا تھا۔ اور ہیرو، چالباز اور رستم کے روپ میں بارہا تمھارے دکھوں کو تھپکیاں دیں..."

تانیا کو اپنے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود اس بار سوال اس نے کیا "پروفیسر... تم ہی بتا کر تم لوگ کہاں ہو... اور تمھارا حوالہ کیا ہے؟"

پروفیسر کسی [illegible] بعد گویا ہوا۔ "انسان ہر رنگ ہر جہت ہوتا ہے تانیا۔ وہ بیک وقت بہت کچھ ہوتا ہے۔ شعر کہنے اور ستاروں کی طلب کرنے والا ہیرو بنتا چاہتا ہے... لیکن اندر سے رستم کی طرح بے وقوف ہوتا ہے۔ اس میں حسد، رقابت، لالچ اور خود نمائی کا عنصر ہوتا ہے، چیپا کی طرح وہ راگی کی طرح موسیقی کا رسیا ہوتا ہے تو کلا آمیزن کی طرح افواہیں پھیلانے کا شوقین اور دوسروں کو اپنے مشوروں سے نواز کر اپنی اہمیت جتانے کا خواہاں ہوتا ہے۔ حصول علم اور مطالعے کا شوق اور دلیل اور منطق کا بھی کا میری طرح ہو گا تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ ایسے شخص میں ایک ذہین اور عیار چالباز بھی موجود ہو گا۔ جو لوگوں کو فریب دینے پر مجبور بھی ہو گا... اور اس سے اسے خوشی بھی ہوتی ہو گی۔

"انسان اپنے وجود میں ایک چیستان ہوتا ہے بی بی۔" پروفیسر نے گہری سانس لے کر کہا "وہ کبھی حل نہ ہونے والا معما ہوتا ہے بی بی۔ اب ہم ساتوں کو لو، جن سے تمھیں محبت ہے۔ ہم ایک ہی ہستی کے سات پوشیدہ روپ ہیں۔ دوسری طرف ہم میں سے ہر ایک نے اپنے وجود کا ایک حصہ... اپنا دل تمھیں

سیم کا بھولا ناشتا کر کے گیا تھا اسد ... پھر کی روٹی ... شکر ہے شام کو ناشتا چلنے سے پہلے واپس آ گیا۔

میری موت میرا نقصان نہیں، یہ اُردو صحافت کا نقصان ہے۔

اے اللہ ہم ... مسلمانوں ... ایمان ... درست ...

دیا ہے۔ چالباز جیسا خود غرض شخص بھی تمھارے لیے اپنی کھال تک اُتروانے کو تیار ہو گا۔ تم نہیں سمجھتیں... وہ درحقیقت اُس کی زبانی، اُس کے خالق کا پیغام تھا تمھارے لیے۔"

"نہیں... خدا کے لیے، خاموش ہو جاؤ۔" تانیا دونوں کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر چیخی۔

"راگی بھی تو تانیا چاچی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ لیکن اُس کی آواز بدل گئی۔ وہ کسی اور کی آواز تھی "تم چلی جاؤ گی تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔"

"یہ کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟" تانیا چیخی اور بے اختیار وہ اسٹال کے پچھلے پردے کی طرف جھپٹی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس پردے کے پیچھے کوئی حرکت نہیں تھی۔ وہاں سے اُسے دیکھا جا سکتا تھا لیکن وہ خود اس پردے کے پار نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے وہ پردہ نوچ ڈالا، جس نے نہ جانے کب سے اُسے اس کٹھ پتلی ہوئے... اور ناخوش آدمی سے دُور کر رکھا تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت تھا۔ ستا ہوا چہرہ، آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے۔ لیکن اس ستے ہوئے چہرے پر اُن حلقہ زدہ آنکھوں میں سختی تھی... تلخی تھی، بربی تھی۔ وہ سمجھوتا کرنے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن وہ اُس کی محبت کے لیے مرا بھی جا رہا تھا۔ مُردہ چہرے اور زندہ آنکھوں والے اس شخص کا دایاں ہاتھ اُٹھا ہوا تھا... اور اس میں وہ ڈوری تھی، جس کے دوسرے سرے پر پروفیسر عقل مند اُس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ پتلی تھی جسے تانیا چالباز کے نام سے جانتی تھی۔ اس وقت اُن دو ہاتھوں کے حوالے سے اس کا وجود ترازو معلوم ہو رہا تھا، جو نیکی اور بدی کو تول رہی ہو... متوازن کر رہی ہو۔ صرف نیکی اور بدی ہی نہیں، وہ نفرت اور محبت، یاس اور امید کی میزان معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی منقسم تھا۔

ایک طرف روشنی تھی اور دوسری طرف تاریک سائے... ایک طرف خدا اور دوسری طرف ابلیس۔

تانیا کے لیے وہ آگہی اور عرفان کا لمحہ تھا۔ اس لمحے میں اُس نے لڑکپن کی چوکھٹ پار کی اور جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا۔ اب وہ ایک عورت تھی، جو اپنے محبوب کو اپنے وجدان کے حوالے سے دیکھ، سمجھ اور پرکھ سکتی تھی۔ وہ اس شخص کو پوری سچائی کے ساتھ پہچان سکتی تھی، جس نے شیطان بن کر زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی... جس نے انسان کی شکل کی کٹھ پتلیاں بنا کر خدا اور انسان.. دونوں کا مقابلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کی کٹھ پتلیوں میں اُس کے نہ چاہنے کے باوجود محبت اور ہمدردی کی روشن صفات جگمگا اٹھی تھیں... کہ خدائے بزرگ و برتر عظیم ترین ہے۔

تانیا نے اُسے غور سے دیکھا... سمجھا کہ وہ کس طرح خود سے لڑ رہا ہے۔ اس نے وہ سزا بھی پڑھ لی، جو اُسے دی گئی۔ وہ جو بدی اور شیطنت کا پجاری تھا، اُسے شکست کی صورت نیکی دے دی گئی تھی۔ اُس کی اپنی تخلیق کی صورت میں۔ اُس کی مخلوق اُس پر حکمران ہو گئی تھی۔ وہ ساتوں پتلیاں اُس کے اپنے وجود کے حوالے تھے... اور خدا نے اُن کے ذریعے اپنی تخلیق کے نو ایسے رُخ عیاں کر دیے تھے، جن سے تخلیق خود بھی بے خبر تھی۔ اُس پر بلا واسطہ زندگی کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ وہ اسٹال کے پچھلے مخفی حصے میں پردے کے پیچھے ہی جی سکتا تھا... اور وہ بھی اپنی باغی مخلوق کے حوالے سے۔ وہ ان میں نیکی کی روشنی دیکھ کر کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بے بسی اُس کی تلخی اور تندی کا سبب تھی۔ کم از کم وہ خود تو شیطنت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے آزاد تھا۔

اس ایک روشن لمحے میں تانیا نے اُس کے وجود میں اُترے ہوئے زہر کے تریاق کے متعلق بھی جان لیا۔ وہ خود ہی اس کا تریاق تھی... لیکن اُس نے یہ بھی جان لیا کہ وہ اُس سے کبھی محبت طلب نہیں کرے گا... کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر اُس نے بِن مانگے اُسے محبت نہ دی تو وہ اندھیروں میں سسک سسک کر مر جائے گا۔ یہ... یہ ظلم ہو گا۔

تانیا نے بانہیں پھیلائیں۔ وہ جذبۂ ترحم نہیں تھا، کمزور اور بے قدر جذبہ۔ وہ جذبۂ عشق تھا۔ عظیم اور توانا جذبہ، جو زہر آلود جسم میں سے زہرِ ہلاہل یہ جانتے ہوئے بھی چوس لیتا ہے کہ وہ زہر اُسے چاٹ جائے گا... کاٹ ڈالے گا... نفس نفس قتل کرے گا، قسطوں میں...

"آذر... آذر... میرے آذر..." اس نے تڑپ کر اُسے پکارا۔ پکار تو اُس کی بانہیں بھی رہی تھیں۔

اور اگلے ہی لمحے وہ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس کی بانہوں میں تھا۔ تانیا اُس کے لرزتے ہوئے جسم کو تھپتھپا رہی تھی... سرگوشیوں میں اُسے بتا رہی تھی "آذر... میرے آذر... میں نے تو ہمیشہ تمہیں چاہا ہے۔ تم جیسے بھی ہو، میں نے اس کے متعلق سوچے بغیر تمہاری پرستش کی ہے۔ میں کیا کروں تمہارے لیے... میں تم سے محبت پر مجبور ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔"

وہ کم عمر تھی، آذر دُنیا دیکھ چکا تھا لیکن سہارا تو نو عمر لڑکی ہی دے رہی تھی... اس طرح، جیسے اُس نے بارہا شرمسار چالباز کو سہارا دیا تھا۔ پھر اندھیرے میں امید کی پہلی کرن پھوٹی۔ آذر تڑپ تڑپ کر بکھر بکھر کر اُسے پکار رہا تھا۔ "تانی... تانی... تانی... میری تانی" لیکن اُس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا، جیسے اُس کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔

"آذر... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

پھر تانیا کو اپنے ہاتھ پر نرم گرم اور گداز سیال کا لمس محسوس ہوا۔ اس ہاتھ پر جس سے اُس نے بد صورت، حد درجہ شیطانی مگر روشن وجود کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اُسے پتا چل گیا کہ وہ آنسو ہیں، آنسو، جو بڑے محترم، بے حد مقدس ہوتے ہیں... اور پھر وہ تو اُس شخص کے آنسو تھے، جو زندگی میں کبھی نہیں رویا تھا۔ وہ آنسو ندامت اور پچھتاوے کے تھے... وہ آنسو محبت کے تھے۔ آذر کا بُت کدہ ڈھل رہا تھا اور بُت کدہ بھی کبھی بُت کدہ نہیں رہتا۔ وہ تو صرف کعبہ ہوتا ہے۔ بُت ٹوٹ جانے کے بعد... کعبہ ڈھلنے کے بعد۔

وہ اُس تاریکی میں دیر تک ایک دوسرے میں مدغم رہے۔ آذر صرف مقدس [illegible] نے اپنا دین... اپنا وجود [illegible] معصومیت کو سونپ دیا تھا، جس سے وہ تمام عمر روح کی گہرائیوں سے نفرت کرتا رہا تھا۔ اس نے خود کو بیچ دیا تھا... وہ محبت بھری بانہوں کے عوض... محبت کے عوض۔ زندگی میں پہلی بار وہ حالتِ عبادت میں تھا۔

ksPk.com

وہ اس وقت بھی نہیں ہٹے، جب قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ گوبلو نے بڑی حیرت اور محبت سے انہیں دیکھا، اور پھر ایک طرف ہٹ گیا، جہاں سے اسٹال کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ پھر اُس نے اسٹال کے اسٹیج پر نظریں جمائیں اور پکارا۔ "ہیرو... چھوٹے باس... تم سب لوگ کہاں ہو۔ چالباز... ترنگی... رستم... بدتمیزن... سبھی کہاں ہو تم لوگ۔ یہاں آؤ... میں تمہیں ایک خوشخبری سنا دوں۔ تانیا بی بی واپس آ گئی ہیں۔ اب وہ کبھی ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی... ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی..." یہ کہہ کر اُس نے اپنا ماؤتھ آرگن منہ سے لگا لیا۔ فضا میں جانی پہچانی دُھن گونجنے لگی... "اللہ ہی اللہ... اللہ ہی اللہ... اللہ ہی اللہ......"